اسلامی قیادت

سیرت رسول اللہؐ کے آئینہ میں

خرّم مراد

فہرست

پیش لفظ

آج دُنیا بھر میں انسانوں کے بے شمار قافلے اس عزم کے ساتھ چل رہے ہیں کہ وہ زندگی کا سفر اسی راہ پر طے کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی ہے، اور اپنی شخصیت اور سوسائٹی کی تعمیر اسی ہدایت کے مطابق کریں گے جو آپؐ نے دی ہے۔ آج کی دنیا میں جب کہ انسانیت کا قافلہ کئی سو سال سے ایک ایسی راہ پر جا رہا ہے جو آپؐ کی راہ سے مختلف اور متضاد ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں۔ رکاوٹیں لاتعداد ہیں اور مشکلات بے پناہ۔ چلنے والے بھی کمزور ناتواں ہیں۔

راکب خستہ و بیمار پیر است (سوار تھکا ماندہ، بیمار اور بوڑھا ہے)

راہ بھی کٹھن ہے مگر تسلی کا سامان یہ ہے کہ

بپایش ریگ ایں صحرا حریر است (اس کے نقشِ قدم کی بدولت اس صحرا کے سنگ ریزے بھی ریشم کی مانند ہیں۔

اس لئے ساری مشکلات کے باوجود قافلوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اور سفر برابر جاری ہے۔ ان قافلوں کا نام آج کی زبان میں تحریک اسلامی ہے۔

ہر وہ قافلہ جو انسان کے لئے اور اپنے لئے زندگی کی نئی شاہراہ کھولنا چاہتا ہو اپنی کامیابی کے لئے ایمان و یقین، عزم و ارادہ، عمل اور کردار اور اخلاق اور قربانی

کے ساتھ ایک اچھے سالارِ قافلہ کا محتاج ہوتا ہے۔ جس طرح اسلامی قافلہ کے ہر قدم کے لئے ایک ہی نقشِ پا رہنما ہے۔ اور وہ نقشِ مصطفویؐ ہے۔ اسی طرح قافلہ کے سردار کے لئے بھی انہی نقوشِ پا کی پیروی میں سعادت اور کامیابی کی ضمانت ہے جو سالارِ اول نے چھوڑے ہیں۔ سچ کہا جائے تو قافلہ کا ہر فرد ہی کسی نہ کسی درجہ میں اور کسی نہ کسی مقام پر امام ہے۔ اور اس ہدایت و رہنمائی کا محتاج ہے جو اُس کو ان نقوشِ پا سے مل سکتی ہے۔

میرا یہ مقام تو نہیں کہ میں ان نقوشِ پا کو اُجاگر کر سکوں۔ اس راہ میں علم سے زیادہ تقویٰ اور عمل اور اتباعِ رسولؐ کا زادِ راہ درکار ہے اور میں ہر پہلو سے ہی تہی دامن ہوں، علم ہو یا عمل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پر کچھ کہنا اور لکھنا ویسے بھی آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کس انسان کے بس میں یہ ہے کہ وہ اس کی جرأت کرے۔ لیکن کراچی جانا ہوا تو جمعیت الفلاح کے زیرِ اہتمام ایک تقریب میں "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسوہ بحیثیت معلم اور قائد" پر چند باتیں کہنا پڑ گئیں۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہی باتیں ایک مسوّدہ کی صورت میں میرے حوالہ کر دی گئیں۔

مجھے موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ اس لئے کچھ ہمّت کی اور اس تقریر کو بنیاد بنا کر یہ کتابچہ مرتب کر دیا۔ اب یہ تحریر اپنی نوعیّت اور حجم دونوں لحاظ سے اس تقریر سے بالکل مختلف چیز ہے جو جمعیت الفلاح کے اجتماع میں کی گئی تھی۔ اگرچہ تحریک اور بنیادی خاکہ اس تقریر نے فراہم کیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید اس سے قافلہ تحریکِ اسلامی کی کوئی ضرورت پوری ہو سکے۔

اس میں شاید کوئی بات نئی نہ ہو۔ سیرت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حکایت اتنی لذیذ ہے کہ جتنی دراز تر ہو کم ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جانا چاہیئے اس کے تناسب سے ابھی کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ اسی احساس نے مجھ کو یہ لکھنے پر آمادہ کر دیا۔

کہ اس خزانہ کا ایک موتی اور اس آفتاب کی ایک کرن بھی کسی کو میرے ذریعہ پہنچ کر مالا مال کر سکتی ہو تو میں کیوں اس ثواب سے محروم رہوں۔ ساتھ ہی میرا یہ یقین بھی میرے لئے مہمیز کا کام کرتا رہا کہ ساری بلندیاں اور ساری دولتیں اسی اسوہ کی پیروی میں مستور ہیں۔

عجب کیا گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

کاش آج کے قافلے اسی چوکھٹ پر آ کر بیٹھ جائیں۔

'بیائے خواجہ چشماں را بمالیم' (آؤ کہ حضورؐ کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں)

میں اپنے بھائیوں سیّد لطف اللہ صاحب اور مسلم سجاد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے تقریر کا موقع فراہم کیا اور مسوّدہ مجھ تک پہنچایا۔ لیکن سب سے زیادہ اپنی رفیقۂ حیات لمعت النور کا کہ جن کے صبر، خاموش تعاون اور مدد کے بغیر میں صبح سے شام تک کئی دن مسلسل اس کام میں نہ لگا سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس حقیر سی نذر کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور سب سے پہلے خود مجھے ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

خرم مراد

اسلامک فاؤنڈیشن، برطانیہ

سلام

مقامِ خویش گر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسوۂ رسولؐ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنُصَلّی عَلیٰ رَسُولِہِ الکَرِیم

شکر و تعریف سراسر اسی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ جس نے ہمیں پیدا کیا۔ دیکھنے، سننے اور سوچنے سمجھنے کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ اختیار کی امانت سپرد کی اور ہماری ہدایت کے لئے رسالت کا سلسلہ قائم کیا۔ اور سلام وعقیدت کی نذر اس کے اس آخری رسولؐ کی خدمت میں کہ جس نے ہمارے رب کی ہدایت ہم کو پہنچائی۔ ہم کو اللہ کی طرف بلایا۔ خوش خبری دی اور خبردار کیا۔ اور ہر سانس ہماری تعلیم اور صحیح راہ زندگی پر ہماری رہنمائی کا کام کرتا رہا۔

بحیثیت قائد اور معلّم

بھائیو اور دوستو!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک روشن اور ایک چمکتے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔ سراجاً منیراً (الاحزاب ۳۳: ۴۶)۔ انہی الفاظ سے قرآن مجید نے

سورج کی مثال بھی دی ہے (نوح ۷۱: ۱۶۔ النبا ۷۸: ۱۳)۔ سورج، توانائی، حرارت اور زندگی کا ایک ایسا بھرپور خزانہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارضی پر اپنی ساری مخلوق کے لئے زندگی، حرارت اور توانائی کے حصول کا سرچشمہ بنا دیا ہے۔ اس کی شعائیں ہر طرف سے، اور ہر رُخ، یکساں طور پر ان نعمتوں کا خزانہ لے کر ضیا فگن ہوتی ہیں۔ اس کا کوئی رخ ایسا نہیں جس کو دوسرے پر ترجیح ہو۔ بلکہ سوچا جائے تو اس کے وجود کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا نہ ممکن ہے اور نہ شاید مناسب اور قرین انصاف۔

یہی حال حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ انسانیت کے لئے زندگی اور گرمی کا سرچشمہ آپؐ ہی ہیں۔ آپؐ کی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ سورج کی طرح، جس پہلو سے دیکھ لیجئے، جس رُخ پر نظر ڈال لیجئے، یکساں روشنی اور ہدایت کا سامان ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپؐ رسول اللہ تھے، بحیثیت رسول اللہ آپؐ نے اپنا کارنامہ سرانجام دیا۔ جو بلاشبہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ بحیثیت رسول اللہ آپ کا اسوہ، پورا اسوہ، ہمارے لئے قابل اتباع اسوہ ہے۔ فکر و نظر کے لئے مدار علم، قلب و روح کے لئے سامان سکون، عمل کے لئے نمونہ۔ اس اتھاہ خزانہ سے ہم کن جواہرات کو منتخب کریں، کن سے اپنی جھولی بھریں۔ اس چمن سے کن پھولوں کو اپنے گلدستہ کی زینت بنائیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل بھی ہے، اور آسان بھی۔ مشکل اس لئے کہ خزانہ لامحدود ہے اور ہمارا دامن محدود۔ کچھ لیں گے تو کچھ چھوڑیں گے، نگاہ اس کی بھی اسیر رہے گی۔ دل اس میں بھی اٹکا رہے گا۔ مشکل یہ نہیں کہ کیا لیں۔ مشکل یہ ہے کہ کیا چھوڑیں۔ آسان اس لئے کہ جو کچھ بھی لیں گے وہ کسی طرح اس سے کم تر نہ ہوگا جو چھوڑیں گے۔

بہرحال اپنے دامن کی تنگی، اپنی نظر کی محدودیت، اپنی وقتی اور زمانی ضرورت اور اپنے مطالعہ اور فیض یابی کی سہولت کی وجہ سے ہم مجبور ہوتے ہیں کہ حضورؐ کی

زندگی کو خانوں میں تقسیم کریں۔ کبھی بحیثیت داعی، کبھی بحیثیت سپہ سالار، غرض اس چراغ کی روشنی مختلف حیثیتوں سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

آج میں آپ کو اس نعمت ہدایت میں اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہوں جو میں نے حضورؐ کی قائدانہ اور معلمانہ زندگی پر غور کر کے اپنی جھولی میں جمع کی ہے۔ کُل کی نسبت سے تو یہ بہت قلیل ہے۔ اور جو کچھ میرے پاس ہے، اس کا بھی کچھ حصہ ہی اس مختصر وقت میں آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ لیکن میری اور آپ کی جو تنگ دامنی اور قلتِ استعداد ہے، اس کے لحاظ بہت ہے۔ اور عمل کرنے کا ارادہ ہو تو ایک بات بھی کافی ہے۔ سورج کی ایک شعاع بھی گل خوابیدہ کو جگا دینے اور اس کو رنگ بو سے مزین کر دینے کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

جہاں یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ انصاف کرنا آسان کام نہیں اور معلم و قائد کی حیثیتوں میں فرق و امتیاز ناممکن ہے۔ اس لئے آپؐ اوّل بھی معلم اور ہادی تھے اور آخر بھی۔ اور قیادت اسی تعلیم کی خاطر تھی۔ وہاں یہ بات بھی ہے کہ تعلیم ہی رسالت کا بنیادی فریضہ ہے۔ تعلیم ہی سے آپؐ کی رسالت کا آغاز ہوا۔ رسالت کے اول لمحہ سے اپنی آخری سانس تک آپؐ انسانوں کو آیات اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے رہے، اور ان کی شیرازہ بندی کر کے انہی آیات اور کتاب اور حکمت کے مطابق زندگی کی شاہراہ پر ان کی قیادت کرتے رہے۔ سورج نکلتا ہے تو لوگ جاگ پڑتے ہیں۔ زندگی کا قافلہ رواں ہوتا ہے۔ قلب و جسم میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اپنے فرائض منصبی کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سراج منیر نے اس پہلو سے ہمارے لئے کیا روشنی چھوڑی ہے؟ یہی آج کا موضوع ہے کہ ہم بھی آج اسی تگ و دو میں مصروف ہیں کہ اپنے

قافلہ زندگی کا سالار حضور ہی کو بنالیں۔ اور وہی فریضہ رسالت انجام دینے کی کوشش کریں جس کے لئے حضورؐ نے اپنی ساری زندگی لٹادی۔

قرآن اور سیرت نبویؐ کا تعلق

ایک بات اور بھی واضح کردوں۔ اس وقت میں اپنی بات صرف ان پہلوؤں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں جن پر قرآن مجید سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اختصار پیشِ نظر ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس طرح قرآن مجید اور سیرتِ مبارکہؐ کے درمیان جو گہرا تعلق ہے وہ سامنے آجائے۔

عام طور پر ہم ان دونوں کو دو بالکل علیحدہ چیزیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ سیرت میں ہمیں سارے بیانات راویوں کے ملتے ہیں اور قرآن ساری تاریخی، زمانی اور مکانی تفصیلات سے تقریباً خالی ہے۔ محمدؐ کا نام بھی دو ہی جگہ آیا ہے۔ بالعموم سیرت نگار قرآن سے استشہاد کم ہی کرتے ہیں اور مفسرین قرآن کی روشنی سے قرآن کے لانے والےؐ کی سیرت اُجاگر کرنے پر کما حقہ توجہ نہیں دیتے۔ جو کچھ تھوڑا علم مجھے ہے اس کی بنیاد پر میں یہ پختہ یقین رکھتا ہوں کہ سیرت کی بہترین کتاب قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کی سب سے عمدہ تفسیر سیرت نبویؐ میں ہے۔ قرآن سیرت کا بیان ہے اور سیرت قرآن کا جیتا جاگتا ماڈل۔

اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس کو قرآن کی صحیح ترین تفسیر پڑھنا ہو، قرآن کو جیتا جاگتا دیکھنا ہو، الفاظ کے بجائے عمل کی زبان میں پڑھنا ہو، اس کو چاہیئے کہ ابن کثیر، کشاف اور رازی وغیرہ سے زیادہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھے۔ اس زندگی کو جس کا آغاز اقراء سے ہوا اور جو یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا۔ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ

وَ اسْتَغْفِرْهُ پر جا کر منتج ہوئی۔ وہ اس زندگی کے ایک ایک لمحہ کو اپنے اندر جذب کر لے تو قرآن کو جذب کر لے گا۔ اسی طرح جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا چاہے۔ وہ ابن اسحٰق، ابن ہشام اور ابن سعد سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرے۔ واقعات اور سوانحی تفصیلاتِ زمان و مکاں سے ہٹ کر، کہ یہ ساری چیزیں کتابوں میں مل جائیں گی، وہ یہاں آپؐ کی کیفیات، صفات، کردار، اخلاق، مقاصد، مناہج سب کچھ پالے گا۔ خصوصاً آپ کی سیرت، بحیثیت معلم وحی اور قائد تحریک اسلامی کے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی تو ایک ایک آیت، ہر ہر لفظ آپؐ کی ان حیثیتوں سے گتھا ہوا ہے۔ ان کا مرقع ہے۔

قرآن میں سیرت کس طرح پڑھی جائے؟

مشکل یہ پڑتی ہے کہ قرآن جو کسی پہلو سے بھی کسی عام کتاب کی طرح نہیں ہے، سیرت پر بھی عام اور رائج طریقہ اور انداز کے مطابق ایک منضبط کتاب نہیں ہے۔ جس میں موضوعات باندھے گئے ہوں، ابواب قائم کئے گئے ہوں، سرخیاں لگائی گئی ہوں، پیراگراف موجود ہوں، اشاریہ تیار ہو اور آدمی تلاش کر کے معلوم کر لے کہ بحیثیت معلم اور قائد آپ کی خصوصیات اور کردار کیا ہیں۔ اس کے لئے قرآن کے انداز سے آگاہی ضروری ہے۔

میں قرآن میں سیرت پڑھنے کے لئے اور معلومات اخذ کرنے کے لئے جو طریقہ (METHODOLOGY) اختیار کرتا ہوں۔ اس کے دو اصول ہیں:۔

پہلا یہ کہ کلام پاک میں جو ہدایات اور احکام دیئے گئے ہیں، جن کی مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے (یا ایھا الرسول یا ایھا النبی) یا آپؐ کے ساتھ مومنین کی جماعت ہے (یا ایھا الذین آمنوا) وہ در اصل آپؐ کی زندگی

یں جاری وساری تھے۔ آپؐ کا عمل ان کے مطابق تھا۔ آپؐ کی سیرت ان کا مظہر تھی۔ اس بات کو اگرچہ سیرت کی کتابوں سے واقعات لا کر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی دلیل خود قرآن میں بھی ہے۔ ایک یہ کہ آپؐ اول المسلمین اور اول المومنین تھے۔ سب سے بڑھ کر، سب سے پہلے، عمل کرنے والے اور ماننے والے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ جو کلام آپؐ کی زبان پر جاری ہوتا تھا ممکن نہ تھا کہ آپؐ کا عمل اس سے مختلف ہوتا۔ آپؐ نے کبھی اپنے رب کے حکم سے روگردانی نہیں کی۔ تیسرے یہ کہ آپؐ کو صرف تبلیغ کا ہی حکم نہیں ملا تھا۔ بلکہ شاہد کا منصب بھی سپرد ہوا تھا۔

اس طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آپؐ کو ذکر یا تسبیح، یا تکبیر یا قیام لیل کی ہدایت ہے تو ہم اس کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ آپؐ ذکر، تسبیح، قیام لیل میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اسی طرح اگر جہاد کا حکم ہے تو اس کی تعبیر یہی ہے کہ آپؐ نے جہاد کیا۔ یا اگر آپؐ کو مشورہ، نرمی، عفو و درگزر، اعراض عن الجاہلین کی تعلیم دی گئی، تو در اصل آپ کی سیرت میں یہ ساری چیزیں موجود تھیں۔ گویا احکام و ہدایت کے پیرایہ میں بیان سیرت ہے۔ اور جہاں قرآن نے خود ہی آپؐ کی صفات کا ذکر کر دیا ہے۔ وہ تو واضح ہی ہے۔

دوسرا یہ کہ قرآن حکیم میں جہاں واقعات پر تبصرہ ہے، گفتگوئیں ہیں، مجادلات ہیں، آپؐ کو تسلی و سہارا دیا گیا ہے۔ یہ سب بھی اپنے انداز میں آپؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ مثلاً اگر قرآن کہتا ہے کہ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ (ان کی بات آپؐ کو رنجیدہ و غمگین نہ کرے) تو یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈہ کا ایک طوفان تھا، تمسخر اور استہزا تھا۔ آپ بحیثیت انسان رنجیدہ اور غمگین ہو جاتے تھے، اور ہدایت الٰہی کی ٹھنڈک سے پھر اس رنج و غم کو جھٹک کر تعلیم و دعوت کے کام میں لگ جاتے تھے۔ یہ پورا بیان ٹھیک اسی طرح قرآن کے الفاظ میں نہیں ہے۔ لیکن الفاظ کے پیچھے یہ پوری

تصویر جھانک رہی ہے۔ اور اس کو بغیر دیکھے گزر جانے سے فہم قرآن نامکمل رہ جائے گا اور سیرت سے بھی شناسائی نہ ہوگی۔

تمہید لمبی ہوتی جارہی ہے لیکن ان باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور ابھی ایک اہم بات باقی ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بحیثیت داعی، معلم، قائد۔ یا یوں کہئے کہ بحیثیتِ رسولؐ۔ آپؐ نے ہر کام جو کیا، ہر قدم جو اٹھایا، ہر پالیسی جو بنائی، ہر رویہ جو اختیار کیا، وہ اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی آپؐ کو پہلے سے بتا دیتا تھا۔ آپؐ کو پہلے سے ہی ہدایت کر دی جاتی۔ کہ اب یہ کرو اور اب وہ کرو۔ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں جہاں آپ کو عملی مسائل اور مراحل درپیش آتے، جہاں پالیسی سازی ہوتی، حکمت عملی وضع کرنی ہوتی، فیصلہ کرنا ہوتا، دو راہوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا ہوتا، وہاں آپؐ کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ نہ کوئی پریشانی ہوتی نہ تذبذب، نہ سوچنا پڑتا نہ عقل سے کام لینا پڑتا۔ میرا خیال اس سے مختلف ہے واللہ اعلم بالصواب۔ اور اگر میرا خیال غلط ہے تو وہ اسے معاف فرمادے اور کم سے کم اجتہاد کا ایک اجر میرے لئے محفوظ کر دے۔ میری رائے میں ایسا سمجھنا قرآنی شواہد اور تاریخی دلائل کے بھی خلاف ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت کے ساتھ بے انصافی بھی ہے۔ آپؐ کی حیثیت مٹی کے ایک مادھو کی نہ تھی۔ آپؐ تو سب سے بہتر انسان، سب سے زیادہ حکمت وعقل کے مالک، سب سے بہتر اخلاق کے حامل، انسانیت کے گل سرسبد تھے۔ قرآن کے بارے میں یقیناً میرا ایمان ہے کہ آپؐ نے لفظاً ومعناً اس کو وصول کیا اور ویسا کا ویسا ہی پہنچا دیا لیکن جس قلب وشخصیت کو قرآن جیسی عظیم شئے حاصل کرنے کے لئے منتخب کیا گیا، وہ قرآن جو پہاڑ پر بھی اُترتا تو وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، وہ قلب وشخصیت خود کتنی عظیم ہوگی۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن کی تبلیغ، قرآن کا قیام، قرآن کی تفصیلات کا تعین ،

قیام دین کی تحریک کو چلانا، یہ سارے کام آپ نے اپنے اجتہاد، اپنی حکمت، اپنی کامل ترین عقل، اور اپنے رفقاء کے مشورے سے کئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ مسلسل اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں تھے، اس کی حفاظت میں تھے۔ آپؐ کا سینہ مبارک علم و حکمت کے نور سے بھر دیا گیا تھا۔ آپؐ کی رضا رضائے الٰہی سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہو چکی تھی۔ ہم جیسے انسانوں کے برعکس آپؐ اس سے پاک تھے کہ کوئی فیصلہ اللہ کی مرضی کے خلاف کریں اور بعض معاملات میں آپ کو، پہلے یا بعد، وحی غیر ملتو سے بھی ہدایت ملتی تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ آپؐ انسان بھی تھے۔ اور انسانوں کی طرح معاملات پر غور و فکر، فیصلہ سازی، پریشانی، غیر یقینیت اور اسی نوعیت کے سارے مراحل سے گزرتے تھے۔ آپؐ نے پوری تحریک کی زندگی میں بڑے بڑے فیصلے، ہدایت قرآن اور اس حکمت الٰہی کی روشنی میں جو آپؐ کے قلب میں رکھ دی گئی تھی اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کئے تحریک کی راہیں متعین کیں۔ آگے بڑھے۔

یہ بات اہم اس لئے ہے کہ اس کو سمجھے بغیر آج کے عملی مسائل میں قرآن و سنت سے دو ٹوک فیصلے حاصل کرنے کی رومانوی خواہش کا علاج نہیں ہو سکتا۔ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بھی ایک وسیع میدان ہے۔ اور حرام و حلال کو عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد میں عملی اقدامات نور رسالت کی روشنی میں اپنی فکر و عقل ہی سے کرنا ہوں گے۔ میرے پاس اپنی اس رائے کے لئے دو بنیادیں ہیں۔

اوّل یہ کہ آپؐ کی تحریکی زندگی کے بیشتر فیصلوں پر قرآن مجید میں مختلف انداز میں تبصرے کئے گئے ہیں۔ اور بعد میں کئے گئے ہیں۔ یہ فیصلے بڑے اہم فیصلے تھے۔ انھوں نے انتہائی نازک مواقع پر تحریک کا رُخ متعین کیا۔ ظاہر ہے کہ آپؐ ہر فیصلہ پہلے سے دی ہوئی واضح خدائی ہدایت کے مطابق کر رہے ہوتے تو یہ بعد کے تبصرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ

اللہ تعالیٰ پہلے سے واضح ہدایت دیتا کہ بدر کے موقع پر کس کا رُخ کرو، قافلے کا یا لشکر کا، بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کرو۔ اُحد کے موقع پر شہر کے اندر رہو یا باہر نکلو۔ منافقین کے عذرات قبول کرو یا نہ کرو۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اذان جیسا معاملہ بھی مشورے سے طے پایا۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی جانشینی کا معاملہ بھی مسلمانوں کی رائے پر چھوڑا گیا۔ ان کی عقل و فکر کے لئے اس سے بڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی تھی اور ان کی ذمہ داری اور اختیارات کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اگر بعض معاملات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح ہدایت آئی تو یہ امر بیان کر دیا گیا۔ مثلاً غزوہ احزاب کے بعد بنو قریظہ کی طرف پیش قدمی۔ آپؐ نے بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے، یا صلح حدیبیہ کا واقعہ، جب بڑے بڑے صحابہؓ کو اطمینان نہ تھا تو آپؐ نے بتایا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

دوم ہمارے لئے ساری روشنی آپ کے اسوۂ میں ہے۔ آپؐ کا اسوہ ہمارے لئے قابلِ اتباع ہے۔ اس لئے کہ آپؐ ایک انسان تھے، اور آپؐ نے اپنی تحریک ایک انسان کی طرح چلائی۔ جب مخالفین نے اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فرشتہ کو اپنا رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا، تو قرآن نے یہی جواب دیا کہ اگر زمین میں چلنے پھرنے والی مخلوق فرشتوں پر مشتمل ہوتی تو ان کے لئے فرشتہ آتا۔ کیونکہ یہ انسان ہے اس لئے ان کے لئے وہی انسان آیا جو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا ہے۔ انسان اپنے جیسے انسان کا ہی اتباع کر سکتا ہے۔ یا کرنے کی سوچ سکتا ہے اور اس جیسا بننے کا امکان بھی محسوس کر سکتا ہے۔ ما فوق البشر کے کارنامہ کی وہ صرف تحسین کر سکتا ہے یا اس سے مرعوب ہو سکتا ہے۔

اگر ہم یہ محسوس کریں کہ ساری تحریک چلانے میں آپؐ کی حیثیت ایک ایسی مشین کی

طرح تھی جس کا اپنا کوئی اختیار اور دخل بالکل نہ تھا۔ یا دراصل آپؐ کے پردہ میں خدا تھا، جو خود تحریک چلا رہا تھا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ اب آئندہ کسی دَور میں کوئی تحریک نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اب کوئی رسول نہیں آئے گا کہ وہ ہر معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر سارے فیصلے کرتا رہے۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھیں کہ آپؐ نے ساری تحریک بالعموم اجتہاد اور مشورہ سے چلائی۔ تو اگرچہ ہم آپ کی گرد پا تک بھی پہنچنے کا نہیں سوچ سکتے نہ آپؐ کے اصحاب کے مقام کا تصوّر کر سکتے ہیں لیکن ــ خدا کی بندگی اور تحریک کی حد تک۔ ہم آپؐ جیسا بننے کی کوشش میں لگ تو سکتے ہیں ــ عشر عشیر ہی سہی ــ ہزاروں لاکھواں حصّہ ہی سہی، کسی حصّہ کی تمنا تو کر سکتے ہیں۔ اس کا خواب تو دیکھ سکتے ہیں۔

یہی تمنّا ہے جو ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے در تک لائی ہے۔ تاکہ ہم آپؐ کی تعلیم و قیادت کے طرز و طریق سے اپنے لئے راہنمائی حاصل کر سکیں۔

آپؐ اور دعوت، مقاصد دعوت

ایک دعوت و تحریک کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے مقاصد اور ہدف (GOALS) صاف اور واضح ہوں، اور رہیں۔ ان کا صحیح شعور حاصل ہو اور برقرار رہے۔ حالات کے دباؤ یا امتدادِ زمانہ سے نہ ان میں ملاوٹ ہو، نہ ان کو تبدیل کیا جائے۔ اگر مقاصد ایک سے زیادہ ہوں تو ان کے درمیان صحیح ترجیحات ہوں اور ترجیحات کا نظام بگڑنے نہ پائے۔ فروعات اصول کی جگہ نہ لینا شروع کر دیں اور اصول پس پشت نہ چلے جائیں۔

کیونکہ دعوت دین کا بیان اور وضاحت بنیادی طور پر قرآن کا کام تھا۔ اس لئے قرآن نے اپنے پیغام کے ذریعہ اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قیادت میں چلنے والی تحریک میں اور اپنی تعلیم میں ان ساری باتوں کا التزام کریں۔

دعوت کی نسبت رب کے ساتھ

پہلے ہی دن سے آپؐ نے جس چیز کی طرف بلایا اور جو کچھ سنایا اور پہنچایا اس کا رشتہ اپنے رب کے نام کے ساتھ قائم کیا۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ دعوتِ اسلامی کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی میں علم کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ہدایت

صرف وہی دے سکتا ہے۔ (العلق ۹۶:۱-۵ یونس ۱۰-۱۵:۳) اگرچہ قرآن کا ہر لفظ آپؐ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا اور کوئی مادّی شہادت اس بات کی نہ تھی کہ یہ آپؐ کا کلام اور آپؐ کی دعوت نہیں۔ لیکن آپؐ نے مسلسل اور بار بار اس بات کا اعادہ کیا اور کرتے رہے کہ اس دعوت اور پیغام کو نسبت آپؐ کی ذات سے نہیں ہے بلکہ صرف رب کے نام سے ہے۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ یہ دعوت داعی کے نام سے منسوب ہو کر رہ جائے اور بلانے والے بھی بالآخر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ ہم کسی انسان کے خیالات کی طرف بلا رہے ہیں۔

خدائے واحد کی کبریائی

سارے جھوٹے خداؤں کی کبریائی ختم کرکے صرف خدائے واحد کی کبریائی کا اعلان و قیام۔ یہ آپؐ کی دعوت و تحریک کا وہ بنیادی مقصد تھا۔ جو آپؐ نے شروع سے آخر تک رکھا اور کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۷۴:۳)

ضمناً یہ بات بھی پیش نظر رہنا اہم ہے کہ دعوت اسلامی کے لئے ان دونوں ابتدائی اور بنیادی باتوں کی اہمیت کے پیش نظر آپؐ نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ ان کی حیثیت نظری نہ ہو اور یہ صرف فکری مسائل اور فلسفیانہ خیالات تک محدود نہ رہ جائیں۔ نہ ان کا اہتمام صرف زور بیان تک محدود رہے۔ بلکہ یہ شعور، حافظہ، زبان اور عمل میں ہر دم جاری اور ہر لمحہ تازہ رہیں۔ اس وقت کے مومن کی زندگی تو آپؐ کے ایک مطیع مجاہد کی زندگی تھی اور اس مجاہد کی زندگی میں آپ نے بسم اللہ اور اللہ اکبر کو جس طرح سمو دیا وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کا تعلیم کا طریقہ کتنا مؤثر اور کتنا دور رس تھا۔ اسی طرف آپ نے دعوت کی دوسری اہم بنیادوں اور تعلیمات

کو راسخ کرنے اور ہر لمحہ تازہ اور سامنے رکھنے کا اہتمام کیا۔ مثلاً اللہ کی وحدانیت، آپؐ کی رسالت، اللہ کے ساتھ تعلق۔

اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے اعلان اور قیام کے ہدف کے چند اہم اجزاء تھے، جن کا آپؐ نے پورا اہتمام کیا۔

اللہ کی بندگی کی اوّلیت

ایک یہ کہ انسانوں کو سب سے بڑھ کر اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔ یہ دعوت کا وہ بنیادی پہلو تھا، جو کبھی مدھم یا اوجھل نہ ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد ہر قسم کے مراحل آئے جن میں سیاسی اور معاشی مقاصد بھی حاصل کئے گئے۔ معاشرتی اصلاح بھی کی گئی۔ تلوار بھی اٹھائی گئی۔ مالِ غنیمت بھی جمع کیا گیا۔ کفار سے صلح اور جنگ بندی کے معاہدات بھی ہوئے۔ لیکن ہر وقت یہ بنیادی دعوت نمایاں رہی۔

ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ (الانعام ۶: ۱۰۲)

یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ ہر چیز کا خالق لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو۔

اس کے لئے بعض دفعہ ایسے انتہائی دل آویز پیرائے بھی اختیار کئے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (الذاریٰت ۵۱-۵۰)

پس دوڑو اللہ کی طرف

بادشاہوں کو خطوط لکھے تو یہی بات سب سے اوّل تھی۔ یہودیوں سے مطالبہ تھا تو یہی نجران کے عیسائی آئے تو ساری جزئیات کو چھوڑ کر یہی کلمہ مشترک تلاش کیا۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔	وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران۔ ۳:۶۴)

اور جب اُمت مسلمہ کی تشکیل اور اجتماعی شیرازہ بندی کے بعد اس کے سپرد جہاد اور شہادتِ حق کا فریضہ کیا گیا تو سرنامہ یہی لکھا ہوا تھا۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع و سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو.... ... اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے ...... اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ... وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ..... وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج۔ ۲۲: ۷۷۔۷۸)

قرآن نے اسی لئے آپؐ کے منصب اور کام کا اظہار دَاعِیًا الی اللّٰہ کے الفاظ سے کیا۔

جھوٹے خداؤں کے خلاف جہاد

دوسرے یہ جہاں ہر لمحہ اللہ کی طرف بلانے کا کام اول رہا، وہاں اللہ کے علاوہ جن کو بھی انسان نے خدا بنایا تھا، یا جو انسان خود انسانوں کے خدا بن بیٹھے تھے، یا جو قوتیں اور ادارے خدا سے بغاوت پر مبنی تھے۔ ان سب کے خلاف آپ نے تنقید اور جہاد کا کام کیا۔ ان میں سے کسی کے ساتھ مصالحت و شرکت نہ کی۔ ان میں سے کسی کو کوئی جواز فراہم نہ کیا۔ اگرچہ یہ سارا کام بڑی حکمت، انسانی جذبات کے لحاظ اور

اخلاقی اصولوں کی پابندی کے ساتھ ہوا۔ لیکن اس میں ڈھیل نہ دی گئی۔ براہ راست نام لینے سے اجتناب، گالی سے پرہیز، بتوں تک کے خلاف دشنام طرازی سے احتراز، یہ سارے اخلاقی اصول برتے گئے۔ لیکن بقائے باہمی (Co-Existence) پر آپؐ راضی نہ ہوئے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ (اللہ کی بندگی کرو) کے ساتھ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (اللہ سے باغی ہر قوت سے الگ رہو) کی دعوت بھی تھی اور اس پر عمل بھی تھا۔

بے شمار شواہد قرآن اور سیرت میں موجود ہیں کہ دعوت کا یہی پہلو تھا جس کی وجہ سے آپ کے مخاطبین تڑپ کر آپؐ کی مخالفت پر جمع ہو گئے۔ اور اپنی ساری قوتیں آپؐ کی دشمنی پر لگا دیں۔ یہ صرف پتھر کے بتوں تک کی بات نہ تھی۔ کہیں آباؤ اجداد کا نام اور ان کی عزّت تھی۔ کہیں برسوں سے پیوست تعصبات اور رسم و رواج تھے۔ کہیں سوسائٹی اور کلچر کے بت تھے۔ کہیں نسل و رنگ کا معاملہ تھا۔ کہیں سوسائٹی اور کلچر کے بت تھے۔ کہیں نسل و رنگ کا معاملہ تھا۔ کہیں قومی عصبیت تھی۔ کہیں مال تھا۔ کہیں اپنی برتری اور تفوق کا سوال تھا۔ کہیں خواہشات نفس تھیں۔ کہیں اقتدار تھا۔ کہیں علم و تقویٰ کا پندار تھا ــــ بُت پرستی (Idolatory) کی نوعیت کچھ بھی ہو، آپؐ نے سب پر ضرب لگائی۔ اور اسی لئے سب نے آپؐ کی مخالفت پر کمر باندھی۔

اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا	کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ
اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔	بس ایک ہی خدا بنا ڈالا۔ یہ تو بڑی
وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْھُمْ	عجیب بات ہے۔ اور سرداران قوم
اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا	یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور
عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ۔ اِنَّ ھٰذَا	ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت

پر۔ یہ بات توکسی اور ہی غرض سے کہی جارہی ہے۔ لَشَیْءٌ یُّرَادُ۔ (صٓ-۳۸: ۵-۶)

دعوت کا تحفظ

تیسرے یہ کہ اپنی دعوت و مقاصد میں آپؐ نے کوئی ترمیم نہیں کی۔ کوئی کمی نہیں کی۔ کوئی اضافہ نہیں کیا۔ کسی کی ماہیت نہیں بدلی۔ کوئی چولا نہیں بدلا۔ اس سلسلہ میں آپ پر بیرونی دباؤ بھی پڑے اور اندرونی دباؤ بھی۔ بیرونی دباؤ کا ایک اشارہ اس واقعہ میں ہے جب ابوطالب کے ذریعہ آپ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بے شک آپ اپنے خدائے واحد کی پرستش کریں۔ لیکن مخاطبین کے معبودوں کے خلاف دعوت و جہاد چھوڑ دیں۔ عام طور پر نقل یہ کیا جاتا ہے کہ 'ہمارے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے کہ حضور کی زبان سے کبھی کوئی گالی نہیں نکلی۔ بُرا کہنا چھوڑنے کے پیچھے یہی مطالبہ تھا کہ بقائے باہمی (Co-Existence) پر راضی ہوجائیں۔ اپنے خدا کی بندگی شوق سے کریں، دوسروں کی خُدائی پر ضرب نہ لگائیں۔ اسی طرح اُس واقعہ میں بھی جب آپؐ کو سیم وزر کے ڈھیر، حسن وجمال کے خزانے اور حکومت و سرداری کی پیشکش کی گئی اور آپؐ نے اُن کو ٹھکرا دیا۔ لیکن بہت واضح صورت حال خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ جہاں یہ بات واضح کر دی گئی کہ قائد ہونے کے باوجود آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ دعوت میں کسی تبدیلی کا حق نہیں۔

وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ

ترمیم کرو۔ اے نبیؐ ان سے کہو، میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کروں، میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔

اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۔

(یونس۔۱۰:۱۵)

اصولوں پر ثبات اور ان کا بے لچک ہونا اس بات میں مانع نہ ہوا کہ عملی طور پر تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے، انہی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے، آپؐ ہر وہ اقدام کریں جس سے اصل مقاصد کا حصول قریب تر ہو۔ لیکن اس پر آپؐ کبھی تیار نہ ہوئے کہ اپنے پیغام میں کوئی تبدیلی کرلیں۔ ایک خدا کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے خداؤں کی بندگی کا جواز بھی نکل آئے۔ ایک لیڈر کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی تسلیم کرلئے جائیں۔ وہ پجاری، وہ تاجر، وہ قبائلی سردار جو قوم کے خدا بنے بیٹھے تھے، ان میں سے بھی کسی کا کچھ حصہ نکل آئے۔

دراصل یہ پالیسی لازمی نتیجہ تھی قرآن کی دو اہم اور بنیادی ہدایات کا۔ ایک یہ کہ آپؐ کا جو پیغام (رسالہ) دیا گیا ہے، آپؐ اس کو پہنچائیں اور بلا کم وکاست پہنچائیں۔ دوسرے یہ کہ آپؐ دین کو قائم کریں۔ پورا کا پورا کریں اور کسی دوسری راہ پر نہ نکل جائیں ــــ

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

يٰٓاَيُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّــغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ

(المائدہ۔۵:۶۷)

کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَي الْمُشْرِكِيْنَ

کو سخت ناگوار ہوئی ہے۔ جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔

(الشوریٰ۔ ۴۲: ۱۳)

سارے اجزائے دعوت کا لحاظ

چوتھے یہ کہ آپؐ کی دعوت کے مختلف پہلو تھے۔ وہ سارے پہلو ہمیشہ آپؐ نے ملحوظ رکھے۔ ان سارے اجزاء کو زندہ رکھا۔ میں خاص طور پر تین پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اول۔ انذار یعنی آگاہ کرنا اور خبردار کرنا۔ دوم، دعوت استغفار، توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت۔ اور سوم تبشیر۔ مبشر اور نذیر ہونے کا تذکرہ سورۂ احزاب میں اس جگہ کیا گیا ہے جہاں بحیثیتِ رسول آپؐ کے اسوہ کے مختلف پہلو، آپؐ کی مختلف حیثیتوں یا آپ کے فرائض اور کام کے اہم گوشے واضح کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بشارت وابستہ ہی استغفار اور توبہ کے ساتھ ہے، اور یہ حقیقت قرآن میں بے شمار جگہ بیان کر دی گئی ہے۔

انذار

انذار کا کام تو آپؐ نے بالکل ابتداء سے ہی شروع کر دیا تھا۔ قم فانذر (المدثر)۔ اور پورا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے۔ اس کام میں خدائی ہدایت سے بے نیازی، بغاوت، استکبار اور مستکبرین کے پیچھے چلنے کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرنا شامل تھا۔ جو بات اہم ہے وہ یہ کہ اوّل تو آپؐ نے ان نتائج و عواقب میں دنیوی اور اخروی دونوں نوعیت کے انجام کا ذکر کیا۔ دونوں کو اہمیت دی۔ ساتھ ہی توجہ اور فکر کو اخروی نتائج پر مرکوز کیا

کہ وہی اصلی اور باقی رہنے والے ہیں۔ دوسرے یہ کام صرف دھمکی دے دینے کی حد تک محدود نہ تھا۔ بلکہ آج کی اصطلاح میں کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں سوسائٹی کا پورا نقد و تجزیہ شامل تھا۔ یعنی (Critique)۔ اور اس پر تاریخی اور واقعاتی (Empirical) اور نظریاتی اور عقلی (Theoretical) دونوں قسم کے دلائل قائم کئے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

استغفار

استغفار اور توبہ کی دعوت بھی بنیادی جزو کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان دونوں کا ذکر جس اہتمام سے کیا گیا، ان پر جو زور دیا گیا، ان کے اوپر جن عظیم کامیابیوں اور بشارتوں کا وعدہ کیا گیا ہے[1] وہ سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ صرف استغفر اللہ کی تسبیح کی دعوت نہ تھی بلکہ ایک کارِ عظیم کا مطالبہ تھا۔ یعنی اپنا مسلسل جائزۂ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ یہ تسلیم کرنا کہ صحیح اور غلط کا وہی فیصلہ قابلِ قبول ہے جو مالک کائنات کرے۔ یہ تسلیم کرنا کہ اس کے سامنے جوابدہ ہیں اور وہ علم اور قدرت وعزت کا مالک ہے کہ حساب لے اور انصاف کرے۔ اور اخروی نتائج کو ہی اصل نتائج سمجھنا — قرآن وحدیث میں یہ سارے پہلو واضح کئے گئے ہیں۔ اور حضورؐ کی تعلیم و دعوت میں ان سب کا اہتمام تھا۔

تبشیر

بشارت بھی بڑا اہم جزو ہے۔ پھر یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ بشارتیں دنیا

---

[1] ھود ۱۱: ۳، ۵۲، ۶۱، ۹۰۔ نوح ۷۱: ۴، ۱۳۔ آل عمران ۳: ۱۳۳، ۶۔

اور آخرت دونوں سے متعلق تھیں۔ اگرچہ اصل، بہتر اور باقی رہنے والا اجر آخرت کا ہی ہے۔ ایک طرف یہ کہ مومن رہو گے تو دُنیا میں غالب ہو گے، خلافت ارضی کا وعدہ ہے، آسمان و زمین سے برکتوں کے خزانے کھول دیں گے۔ دوسری طرف، وہ جنت جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں، مغفرت، رحمت، ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں، خلود ابدی، رضوان الٰہی، جو کچھ چاہو وہ ملے گا اور ہمارے پاس اس سے بھی زائد ہے[1]۔

جو بات خصوصی توجہ چاہتی ہے وہ یہ کہ آپؐ نے اس طرح اپنے ساتھیوں کے سارے محرکات کو بڑے مضبوط پائیدار، پرکشش، جذبات انگیز، تازہ و شاداب سانچوں میں ڈھالا اور ہر لمحہ اس کا اہتمام کیا کہ یہ پہلو صرف مسلمہ (Understood) ہی نہ ہو، بلکہ آشکار ہو، اس کا تذکرہ ہو، اس کا احتساب ہو، ان وعدوں پر اعتماد ہو۔ ان انعامات کی طلب ہو۔ ہر کام میں ہو، خواہ یہ تلوار اُٹھانے کا کام ہو، حدود کا نفاذ ہو یا پیسے نکالنے کا مطالبہ ہو۔

ترتیب اور تقدیم و تاخیر

پانچویں یہ کہ آپ نے دعوت کے مختلف اجزاء کے درمیان ترتیب، تقدیم و تاخیر اور اہمیت کا وہی نظام قائم رکھا جو اس کی روح اور مزاج کے مطابق تھا۔ کہیں بیج، درخت اور پھل کا تعلق تھا۔ کہیں بنیاد، ستون اور عمارت کا نظام تھا۔ کسی کی حیثیت بنیاد کی تھی تو کسی کی آرائش و زیبائش کی۔ کیونکہ آپؐ کا کام صرف ایک فلسفی کی طرح خیالات پیش کر دینا، ایک واعظ کی طرح نصیحت کر دینا، ایک پکارنے والے کی طرح پکار دینا نہ تھا۔ بلکہ اپنی دعوت کے گرد ایک اُمت کی شیرازہ بندی اور اس اُمت کو دعوت، جہاد اور

---

[1] دیکھئے آل عمران۔ ۳: ۱۳۹۔ النور ۲۴: ۵۵۔ المائدہ ۵: ۶۶۔ الاعراف ۷: ۹۶۔ التوبہ ۹: ۲۰، ۲۱

قیام دین کا ذریعہ بنانا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپؐ ادارے بنائیں۔ ظواہر کا نظام قائم کریں کہ ان کے بغیر اجتماعی نظام نہیں بنتا، صرف جذبات میں اُبال آسکتا ہے۔ یا خانقاہیں بن سکتی ہیں۔ لیکن آپؐ نے ہمیشہ دین کے مقاصد اور دین کے ظواہر کے فرق کو ظاہر کیا۔ مومن ہونے کے اصل معیارات بیان کئے۔ افعال کے درجات اور ان کی باہمی ترتیب کو ذہن نشین کرایا۔ اور اس کا پورا اہتمام کیا کہ ادارے مقاصد کی جگہ نہ لیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا ایک بیان کافی ہے۔ اگرچہ آیات و احادیث بے شمار ہیں، جہاں ان کُنتُمْ مومنین (اگر تم مومن ہو کہا گیا ہے۔ وہی قرآنی مقامات دیکھ لئے جائیں اور جہاں کون مومن ہے اور کون مومن نہیں ہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہی احادیث دیکھ لی جائیں۔

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے	اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ
اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس	عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
شخص کے کام کے برابر ٹھہرالیا جو	كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ
ایمان لایا، اللہ پر اور روز آخر پر	الْاٰخِرِ وَجٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ	لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ۔
میں۔ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔	(التوبہ۔ ۹: ۱۹)

آپؐ اور مقام دعوت

نفس دعوت کے بارہ میں آپؐ کے اسوہ کے ان پہلوؤں سے آگے بڑھئے تو مقام دعوت سے آپؐ کے قلب وذہن کا تعلق اس کی عظمت اور ذمہ داری کا احساس، اس کے لئے آپؐ کی لگن، اس کے لئے اپنی علمی، روحانی، اخلاقی اور عملی تیاری اور اس راہ میں آپؐ کی نفسیاتی کیفیات کا ایک وسیع اور اہم موضوع ہے، جس پر قرآن مجید نے روشنی ڈالی ہے۔ ہم صرف چند موتی ہی چن سکتے ہیں۔

احساس عظمت اور دِل کی لگن

دعوت الی اللہ، شہادت حق اور اقامت دین کا مقام اور کام، جو وحی الٰہی کی امانت کا لازمی نتیجہ ہے، بڑا نازک اور گرانبار کام ہے۔ ہر اس شخص کے لئے ہے جس پر یہ ذمہ داری آتی ہو۔ لیکن جو سالار قافلہ ہو اس کے لئے اس عظیم ذمہ داری کے بوجھ کا کیا ٹھکانا۔ کوئی بھی اگر اس کو ایک مشغلہ اور ایک پیشہ کی طرح یا ماحول کے دباؤ یا صرف اپنی اندرونی کیفیات کی تسکین کی خاطر اُٹھائے تو اس کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کو اپنے رب کی طرف سے عائد کردہ فرض نہ سمجھے۔

اس لئے کہ یہ راہ کٹھن ہے، اور اس کے مطالبات نازک۔ اور سب سے زیادہ قائد

کے لئے۔ اس کو، سب سے بڑھ کر، اس راہ میں مکمل بے نفسی، بے غرضی، خلوص اور للہیت درکار ہے۔ اس کو انتہائی اعلیٰ اخلاق کی ضرورت ہے۔ لازم ہے کہ وہ مخالفتوں کے طوفان میں صبر وثبات پر قائم رہے۔ کامیابی کے مادی امکانات معدوم ہونے کے باوجود اپنے کام میں لگا رہے۔ بُرائی کا جواب بھلائی سے دے۔ گالیوں اور کانٹوں کے درمیان مسکراہٹ کے ساتھ گزر جائے۔ پتھر کھا کر ہدایت کی دُعا دے۔ مخالفین تک کے ساتھ طنز واستہزاء اور تذلیل وتحقیر کی روش اختیار نہ کرے۔ کمزور اور ناتواں ساتھیوں کو لے کر دشوار گزار مراحل سے گزرنے کا حوصلہ وہمّت رکھے۔ اپنوں کے ستم بھی خاموشی کے ساتھ سہہ لے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ذمہ داری پر فائز ہونے کے احساسات کے ساتھ کبر اور پندارِ نفس اور تنگ نظری کے جو فتنے ہیں ان سے بھی خود کو محفوظ رکھے۔ گویا اس کے اخلاق مجسم قرآن ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی معراج پر پہنچے ہوئے تھے۔ طائف کی کٹھن وادی سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کے بعد ہی آپؐ کو آسمان کی بلندیوں پر لے جایا گیا۔ عرب وعجم آپ کے قدموں پر ڈال دیئے گئے۔

حضورؐ کو اس بات میں کیا شبہ ہوسکتا تھا کہ آپؐ کو یہ کام اللہ کی طرف سے سپرد ہوا ہے۔ جو کچھ آپؐ کر رہے ہے وہ اللہ کا کام ہے۔ ایسا کوئی شبہ آپؐ کو لاحق نہیں ہوا۔ اس معاملہ میں آپؐ کے یقین کی کیفیت بالکل منفرد تھی، اور اس کا کوئی حصّہ بھی، میرے خیال میں، کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ سے کلام کرتا تھا۔ جبرائیل علیہ السّلام آپؐ کے پاس تشریف لاتے تھے۔ اور وحی آپؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوتی تھی۔ ہم امتیوں کا حصّہ تو بس اتنا ہی ہے۔ جو ہم قرآن کے اِن الفاظ پر یقین کی کیفیت سے حاصل کریں اور یہ ہمارے لئے کافی ہے اگر کما حقہ ہمیں حاصل ہو۔

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً" اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں

کو "اُمت وسط" بنایا ہے۔ تاکہ	وَسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ
تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔	عَلَى النَّاسِ (البقرہ۔ ۲: ۱۴۳)
اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ	یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا
کے مددگار بنو۔	اَنْصَارَ اللّٰہِ (الصف۔ ۶۱: ۱۴)
تم میں کون ہے جو اللہ کو	مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ
قرضِ حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی	قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ۔
گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے	(البقرہ۔ ۲: ۲۴۵)

قرآن میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ (شک کرنے والے نہ ہو جاؤ) کہا گیا تو اوّل تو خطاب کے پردہ میں عتاب کا رُخ مخالفین کی طرف ہے۔ اور دوم یہ کہ اس کیفیت کا اظہار ہے جو اس وقت طاری ہوتی ہے جب کسی کو اپنی آنکھوں سے نظر آرہا ہو کہ سورج نکلا ہوا ہے اور سارے دیدۂ بینا رکھنے والے اس کو جھٹلانے اور مذاق اُڑانے میں مصروف ہوں۔ اور وہ سوچے کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔

اللہ کا کام سمجھنے کی کیفیت

آپؐ نے سارا کام اسی احساس و یقین کے ساتھ سرانجام دیا کہ یہ اللہ کا کام ہے۔ قرآن جب اُترتا تو اکثر اس یقین کو گہرا کرنے کے لئے وضاحت و صراحت سے کام لیتا۔ یہ رب العالمین کی طرف سے اتر رہا ہے، آپؐ حق پر ہیں، آپؐ صراطِ مستقیم پر ہیں، آپؐ مرسلین میں سے ہیں۔ اور اس طرح آپؐ کے ساتھ ساتھ، صحابہ کرام کی کیفیت یقین میں بھی اضافہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس چیز کی یاددہانی سے کسی لمحہ بھی نہ غفلت

برتی جاسکتی ہے نہ فارغ ہوا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ احساس کمزور ہوتا تو خرابیاں سر اٹھاتیں۔ اور جب ہوتا ہے تو اٹھاتی ہیں۔ اگر آپؐ کے کردار کو کسی ایک لفظ سے ظاہر کرنا مقصود ہو تو وہ صبر کا لفظ ہو سکتا ہے۔ محدود معنوں میں نہیں بلکہ اپنے گوناگوں جامع معانی میں ـــــ اور آپؐ کا یہ سارا صبر اپنے رب کی خاطر تھا۔ اس لئے کہ کام بھی اسی کی خاطر تھا۔

اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو — وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۷۴:۷)

مالک کی نگاہوں میں

اس ضمن میں ایک اور اہم کیفیت تھی جو آپؐ پر طاری رہتی تھی۔ اور وہ یہ کہ آپؐ یہ سارا کام اس مالک کی نگاہوں کے سامنے کر رہے ہیں جس نے اس کام پر مامور کیا ہے۔ وہ ساتھ ہے۔ سب کچھ سُن رہا ہے۔ دیکھ رہا ہے۔ وہ بھی جو مخالفین کہہ رہے ہیں۔ یا کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی جو ساتھیوں کی طرف سے ہے۔ اور وہ بھی جو میں کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔

اے نبیؐ اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو۔ تم ہماری نگاہ میں ہو۔	وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (الطور۔ ۵۲:۴۸)
میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔	إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ (طٰہٰ۔ ۲۰:۴۶)
میں جہاں کہیں بھی ہوں وہ میرے ساتھ ہے۔	وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید۔ ۵۷:۴)
ہم اُس کی شہ رگ سے	وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ

زیادہ قریب ہیں۔ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ۔(ق۔۵۰:۱۶)

دو ہوں تو تیسرا وہ ہے۔ (التوبہ۔۹:۴۰)

تین ہوں تو چوتھا وہ ہے۔ کم ہوں یا زیادہ تو بھی وہ ساتھ ہے۔

(المجادلہ۔ ۵۸:۷)

اس کیفیت میں دو خزانے مستور ہیں۔ ایک خزانہ تو سکون، طمانیت، اعتماد، توکل، جرأت، بے خوفی، ولولہ، جوش اور ہر لمحہ تازگی اور شادابی کا خزانہ ہے۔ غارِ ثور اس کی ایک مثال ہے۔ پوری سیرت طیبہ ان واقعات سے بھری ہوئی ہے جو ان ساری کیفیات پر گواہ ہیں۔ ۲۳ سال میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب آپؐ پر تھکن یعنی ذہنی و نفسیاتی تھکن، طاری ہوئی ہو۔ جب اکتاہٹ طاری ہوئی ہو۔ جب جوش و ولولہ میں کمی آئی ہو۔ جب حوصلے پست ہوئے ہوں۔

اور دوسرا خزانہ، ذمہ داری کی عظمت و نزاکت کے احساس کا خزانہ ہے۔ جس کا کام کر رہے ہیں اور جس کو اپنا کام دکھانا ہے، جب وہ کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہو تو قلب و ذہن احساسِ ذمہ داری سے کس طرح خالی ہو سکتے ہیں۔ اور جتنا زیادہ اس کی عظمت و کبریائی کا احساس ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کے کام کی عظمت کا احساس ہوگا۔

عظمت اور ذمّہ داری کا احساس

کام کی عظمت، منصب کی نزاکت اور ذمّہ داری کی گرانباری سے آپؐ ہمیشہ معمور رہے۔ وحی آئی تو لرز گئے، کانپ گئے۔ یہ کپکپاہٹ اور لرزش دل پر بھی تھی اور جسم بھی اس میں شریک تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تو زَمِّلُوۡنِی (مجھے

چادر اڑھادو، کہتے ہوئے آئے۔ قرآن نے شروع میں ہی یا ایہا المزمل اور یا ایہا المدثر کہہ کر خطاب کیا تو اور دوسری کیفیات کے ساتھ اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ایک عظیم الشان کام درپیش ہے۔ اس کی ہیبت طاری ہے۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں نور کی ایک کرن ہے جس سے روشنی کا ایک سامان کرنا ہے۔ ایک پکار ہے الفاظ پر مشتمل جس سے سارے سوتوں کو جگانا ہے۔ ایک چھوٹا سا بیج ہے جس کی آبیاری کر کے ایسے درخت میں تبدیل کرنا ہے جس کی جڑیں ثابت ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں، جو سدا بہار ہو اور جس کے پھلوں اور سایہ سے قافلے کے قافلے نفع اندوز ہوں۔ چنانچہ بے چینی کی جو کیفیت تھی، اضطراب کا جو عالم تھا، ذمہ داری کا جو پہاڑ نظر آرہا تھا، اپنی چادر میں لپٹ جانے کی کیفیت سے قرآن نے ان سب کی عکاسی کر دی۔

ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ دعوتِ حق کے معنی اور اس کی قیادت کی ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ پاؤں پھیلا کر سونے کا زمانہ گزر گیا۔ اپنے خول میں سمٹ جانے کا دور گیا۔ اب تو کمربستہ ہو کر خود کو تیار کرنا ہے اور مسلسل کرتے رہنا ہے۔ اور کھڑے ہو کر، میدان کارزار میں کود کر، ساری دنیا کو آگاہ خبردار کر دینے اور رب کی کبریائی قائم کرنے کی جدوجہد میں لگ جانا ہے اور لگا رہنا ہے۔

قولِ ثقیل

اقراء کا پیغام آپؐ کے لئے علم کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا پیغام نہ تھا بلکہ ایک قول ثقیل تھا۔ جو اپنے دامن میں سنانے، دعوت دینے، ہجرت و جہاد کے مراحل طے کرنے کی ساری کٹھن وادیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ وحی صرف اس لئے نہ تھی

کہ پڑھیں اور ثواب حاصل کریں بلکہ ذمہ داری کا ایک بوجھ تھی۔ ایسا بوجھ جو صرف معنوی ہی نہ تھا بلکہ جسمانی بھی تھا۔ جب وحی آتی تو پیشانی مبارک پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوتے اور اگر آپؐ سوار ہوتے تو اونٹنی بیٹھ جاتی۔

ہم تم پر بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔	اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۔ (المزمل ۔۷۳: ۵)

آپؐ کے لئے یہ کام صرف ایک مشغلہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا مشن تھا ساری زندگی کا۔ جو ایسا لگتا تھا کہ آپؐ کی کمر توڑ ڈالے گا۔ جس کا بار صرف رحمت الٰہی کی دستگیری سے ہی کم ہوتا رہا۔

اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔	وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۔ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ (الم نشرح ۹۴: ۲-۳)

شہادت حق کی ذمہ داری سے آپؐ کا قلب مبارک اتنا گرانبار تھا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ حضورؐ نے ان سے تلاوت قرآن کی فرمائش کی۔ پہلے تو وہ ہچکچائے کہ میں اور مہبط وحی کو قرآن سناؤں۔ جب آپؐ نے اصرار کیا تو انھوں نے سورۃ النساء کی چند آیات تلاوت کیں۔ جب وہ ان آیات پر پہنچے تو آواز آئی کہ عبد اللہ بس کرو۔

پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔	فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا ۔ (النساء ۔۴: ۴۱)

کہتے ہیں کہ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

دِل کی لگن

کام کی عظمت اور ذمہ داری کے احساس کا نتیجہ یہ تھا کہ دعوت و تحریک کی حیثیت آپؐ کے لئے ایک لبادہ کی نہ تھی، جو اوپر سے اوڑھ لیا ہو بلکہ یہ دل کی لگن بن گئی تھی۔ اس نے نہاں خانہ روح میں جگہ بنالی تھی۔ یہ گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ اس کی دھن آپ پر ہر وقت سوار تھی۔ صبح شام یہی ذکر تھا، یہی فکر تھی، یہی مشغلہ تھا۔ اور یہ کیفیت ہر اس چیز کے لئے جو اس مقصد کا تقاضا ہو۔ لیکن سب سے بڑھ کر دعوت کے لئے تھی۔ دل میں ایک سوز تھا۔ ایک خیر خواہی کا ایک چشمہ ابل رہا تھا کہ لوگ ہدایت پائیں، حق تک پہنچ جائیں، صحیح راہ سے لگ جائیں۔ آپ کی اس کیفیت، لگن اور اضطراب کی تصویر قرآن مجید نے یوں کھینچی ہے:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ	اے نبیؐ، شاید تم اس غم میں
اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔	اپنی جان کھودو گے۔ کہ یہ لوگ ایمان
(الشعرا۔ ۲۶: ۳)	نہیں لاتے۔

اس دھن میں اس سوز میں آپؐ اپنے آپ کو ہلاک کئے دے رہے تھے۔ ہدایت کے لئے اس نوعیت کی تڑپ کے بغیر کوئی اجتماعی تحریک چل سکتی ہو گی، اسلامی تحریک کا چلنا بڑا مشکل ہے۔

آپؐ کی اسی حالت کے پیش نظر قرآن کو بار بار آپؐ کا دامن تھامنا پڑا۔ سمجھانا پڑتا کہ آپ کے بس میں ہر ایک کو نعمت ایمان سے فیضیاب کرنا نہیں۔ آپ کو داروغہ، وکیل، فیلڈ مارشل بناکر نہیں بھیجا گیا۔ آپؐ کی بنیادی ذمہ داری پہنچانا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا ہر انسان کا اپنا فعل ہے۔ اس کو راہِ زندگی منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ قرآن کی

ہر اس نوعیت کی آیت دراصل آپؐ کی لگن کو بھی ظاہر کرتی ہے، اور داعی حق کے مقام کو بھی واضح کرتی ہے، اور معلم کو اس کی حدود بھی بتاتی ہے۔

اب کیا اے نبیؐ! تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟	أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَن كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (الزخرف۔ ۴۳: ۴۰)
اے نبی! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔ مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔	إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (القصص۔ ۲۸: ۵۶)
اے نبی تم چاہے ان کی ہدایت کے لئے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے۔ پھر اسے ہدایت نہیں دیا کرتا۔	إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ۔ (النحل۔ ۱۶: ۳۷)
تمہاری قوم اس کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ ان سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالدار نہیں بنایا گیا ہوں۔	وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ۔ (الانعام۔ ۶: ۶۶)

اپنی تیاری

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں پہلے دن سے قرآن مجید کی تبلیغ اور دعوت و

تحریک کا کام شروع کیا۔ اسی لمحہ سے اپنی تیاری کا کام بھی شروع کیا۔ دل و نگاہ اور دامن کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی یوں ہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ طلب، محنت اور اور ریاضت کا تقاضا کرتی ہیں۔

قرآن سے تعلق

قرآن مجید اس ساری تیاری کا سرچشمہ تھا۔ وہ آپؐ ہی پر نازل ہو رہا تھا۔ آپؐ اس کو حاصل کرتے، اس پر تدبر کرتے، اس کا علم حاصل کرتے، اس کو نوک زبان کرتے اور حرزِ جاں بناتے، اس کو جذب کرتے اور اس کے سانچے میں ڈھل جاتے۔ ایک طرف تو آپؐ کی اپنی علمی، روحانی اور اخلاقی تیاری کے لئے یہ ناگزیر تھا، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ دوسرے آپؐ کی رسالت اور دعوت و تحریک کے فرائض کا مرکز و محور بھی یہی قرآن مجید تھا: تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت، تزکیۂ نفس۔

ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔	كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ ۔ ۲: ۱۵۱)

قرآن مجید کے ساتھ آپؐ کا تعلق مارے باندھے کا نہ تھا۔ بلکہ شوق اور محبت کا تھا اس لئے کہ اسی سے آپؐ کو اپنے لئے ساری غذا ملتی تھی، اس شوق کا عکس آپ کے انتظار اور عجلت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ (القیٰمہ۔ ۷۵۔۱۶)

اے نبیؐ، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :

" اگرچہ شوق و محبت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے۔ لیکن اس محبت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہو گی۔ جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبرائیل امین اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس میں تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول ہی مل جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ وہ پورا ڈول ہی ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامہ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے"۔

(تدبر قرآن۔ جلد ہشتم۔ لاہور۔ ص۸۵)

حصولِ علم کا شوق

زبان کی عجلت تو ہدایت الٰہی کے بعد ضبط کے پیرایہ میں ڈھل گئی لیکن دل کا شوق و اضطراب کہاں ختم ہوا۔ اس کے اظہار اور تکمیل کے لئے زبان پر علم میں افزائش

کی التجاء نمودار ہوئی۔

اور دُعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔
(طٰہٰ ۔ ۲۰ : ۱۱۴)

دعوتِ اسلامی کے سامنے جو منزل ہے وہ مکتب وحی میں تحصیلِ علم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ کام خالی کھڑکھڑانے والے برتن سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ذہن و فکر کی بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ حکمت کا خزانہ درکار ہے۔ حضورؐ نے قرآن مجید سے ہی اُس علم و حکمت کا حصول کیا جس کی بنیاد پر آپؐ نے انسان کے لئے پُورا انظام حیات مدون کردیا۔ پھر نہ صرف آپؐ کے اندر علم کے لئے وہ شوق اور اضطراب تھا جو قائد کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف تھا۔ دُعا اس سے تھی۔ بھروسہ اور اعتماد اس پر تھا۔ اس لئے کہ علم کا سرچشمہ وہی ہے۔

پھر جیسے جیسے قرآن آپؐ کو ملتا گیا۔ آپؐ اس کو اپنے قلب و روح کی غذا بناتے گئے۔ اور قرآن کے تھوڑا تھوڑا نازل ہونے میں یہی حکمتِ الٰہی تھی۔ یہ زندگی میں ایک دفعہ کا تعلق نہ تھا۔ نہ یہ کہ جب موقع ملا تو ڈول اندر اتار لیا۔ خواہ وہ جذب و ہضم کا کام ہو یا نہ ہو۔ غافل ہوئے تو مُدتیں بیت گئیں۔

قیامِ لیل اور ترتیل قرآن

اس کا طریقہ کیا تھا؟ شروع میں حضور بستر کا آرام چھوڑ کر رات کے بیشتر لمحات ہاتھ باندھ کر منزل قرآن کے سامنے کھڑے ہوجاتے۔ کبھی آدھی رات۔ کبھی اس سے زیادہ۔ کبھی اس سے کم۔ کبھی ایک تہائی۔ کبھی دو تہائی۔ اور قرآن کو آہستہ آہستہ، سوچ سمجھ کر

قلب وزبان کی ہم آہنگی کے ساتھ تلاوت فرماتے۔ قرآن کو جذب کرنے کا اس سے زیادہ مؤثر اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔

رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو۔	قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ
مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم	نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ
کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور	قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ
قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو.....	الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ......
اے نبی تمہارا رب جانتا ہے کہ تم	اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ
کبھی دو تہائی رات کے قریب اور	تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ
کبھی آدھی رات، اور کبھی ایک تہائی	وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ ۔
رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو۔	(المزمل۔ ۷۳: ۲۔۴، ۲۰)

اس طریقہ کو آپؐ نے آخری عمر تک ترک نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ آپؐ قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ رمضان مبارک میں پورا قرآن دہراتے اور عموماً نماز فجر میں طویل قرأت فرماتے۔

اے نبیؐ، تلاوت کرو اس کتاب	اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ
کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ	مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ
بھیجی گئی اور نماز قائم کرو۔	(العنکبوت۔ ۲۹: ۴۵)

نماز قائم کرو زوالِ آفتاب	اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ
سے لے کر اندھیرے تک اور فجر کے	الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ
قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر	الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ
مشہور ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو،	اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ (الاسراء ۔ ۱۷: ۷۸-۷۹)

یہ تمہارے لئے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر فائز کر دے۔

ذکرِ الٰہی کا نظام

قرآن کے ساتھ ساتھ نماز کا ذکر آگیا۔ دونوں کا رشتہ لاینفک ہے۔ اسی لئے میں یہیں یہ بھی کہہ دوں کہ نماز ہی آپؐ کا سب سے بڑا سہارا تھی۔ آپؐ اس کے ذریعہ ہی مدد حاصل کرتے تھے اور جب کوئی امر آپؐ کو پریشان کرتا تو آپؐ نماز پڑھا کرتے تھے۔

قرآن اور نماز کے علاوہ آپؐ نے کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی واحدانیت کا اقرار، اس کی تکبیر، اس کی تسبیح، اس کی حمد، اس کے شکر، کو اختیار کیا۔ صبح شام، رات دن، ہر لمحہ اور ہر کام کے موقعہ پر، نہ صرف دل کو مشغول کیا بلکہ چھوٹے چھوٹے کلمات کے ذریعہ ان احساسات وکیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ تعداد مقرر کی۔ اوقات کا تعین کیا۔ خود اس نظام کا اہتمام کیا۔ اپنے رفقاء کو اس کی تاکید کی، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا اظہار جماعت کی زندگی میں سمودیا گیا۔ اسی طرح آپؐ نے ہر موقع اور ہر حالت اور ہر ضرورت کے لئے بڑی جامع، قلب و روح کے لئے نشاط انگیز، جذبات کے لئے پرکشش دعائیں تجویز کیں اور ان کی تعلیم دی۔ خاص طور پر آپؐ نے استغفار کا اہتمام کیا۔ کہ اللہ کی عبادت اور اُس سے دُعا کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعوت کا بنیادی جزو ہے۔ آپؐ خود کثرت سے استغفار کرتے تھے اور اس طرح کرتے تھے کہ ساتھی جانتے تھے۔ کہ آپ استغفار کر رہے ہیں۔ ہر نشست کے خاتمہ پر، ہر مجلس کے دوران اس کا اہتمام تھا۔ بعض صحابؓ نے آپؐ کو ۷۰ مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتے دیکھا۔ آپؐ کے طریقہ کی پیروی آپؐ کی

جماعت نے بھی کی۔

صبر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے رب کے ساتھ عبدیت، اخلاص، محبت، شکر اور توکل جیسی صفات کا کامل ترین نمونہ تھے۔ اسی طرح آپؐ اس کی محبت میں بھی سب سے آگے تھے اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دینے میں پیش پیش۔ یہاں ان سارے پہلوؤں کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ لیکن اخلاق کا ایک عظیم خزانہ جو آپؐ کے پاس صبر کی صورت میں تھا۔ اس کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ آپؐ کے سارے اخلاق تو ایک ایسا اتھاہ سمندر ہیں جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اور صرف صبر کے ہی اتنے پہلو ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

آپؐ اور مخاطبین دعوت

اسلام کی دعوت اور تحریک کو آگے بڑھانے کی راہ میں ہر نوع کی مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ بعض مخاطبین کی طرف سے تھیں۔ بعض مخاطبین کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے نتیجے میں اپنے اندر کی کیفیات اور احساسات کا نتیجہ تھیں۔ بعض اپنے ساتھیوں کو بنیان مرصوص بنا کر راہِ حق میں پیش قدمی کرنے کی وجہ سے تھیں۔ ان سب کے مقابلے میں آپؐ نے صبر اختیار کیا۔ صبر کے ساتھ کام کیا۔ یہ بات۔ بڑی جامع اور مختصر ہے۔ لیکن اس کی بعض تفصیلات کا جاننا ضروری ہے۔ ویسے تو برائی کے بدلہ بھلائی اور رحمت وعفو جیسے، جن مکارمِ اخلاق سے آپؐ نے کام لیا وہ بھی صبر کی بنیاد پر ہی وجود میں آئے، لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مخاطبین کی طرف سے مخالفت اور اپنی کیفیات کے وہ بعض پہلو کون سے تھے جن کے مقابلہ میں آپؐ کے صبر کی کیفیت کا جاننا ہمارے لئے اہم ہے۔

قولی مخالفتیں

جسمانی آزار کو برداشت کرنا اور ان کے مقابلہ میں اپنے مقام پر جمے رہنا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھنا خود صبر کا متقاضی ہے۔ لیکن ایک طویل جد وجہد میں سب

سے زیادہ مشکل، جان گسل، روح فرسا اور شدید آلام و مصائب وہ ہوتے ہیں جو زبان کے ذریعہ آتے ہیں۔ جن کو قرآن مجید نے یقولون (جو وہ کہتے ہیں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے کہ جسمانی مصائب اپنی شدت کے باوجود معلوم اور محسوس ہوتے ہیں۔ وہ مستقل جاری نہیں رہ سکتے اس لئے کہ انسانی جسم کی قوت برداشت کی ایک حد ہے۔ ان کے مقابلے میں یہ تو ممکن ہے کہ انسان کمزوری کا شکار ہو کر اپنے موقف سے ہٹ جائے لیکن یہ مشکل ہے کہ وہ فریب کھا جائے۔ اپنے کو صحیح سمجھتے ہوئے غلط راہ پر نکل جائے۔ وہ شک میں پڑ جائے۔ اس کے حوصلے پست ہو جائیں۔ وہ مایوسی اور افسردگی کا شکار ہو جائے۔ اس کی وابستگی اور جذبہ ٹھٹھر کر رہ جائیں۔ اس کے برعکس "قولی" مخالفتیں روح پر زخم لگاتی ہیں، اعصاب کو توڑتی ہیں، ذہن میں رخنے پیدا کرتی ہیں، جان کو گھلاتی ہیں ــــ پھر ان کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ہاتھ اٹھانے کے بجائے زبان چلانا آسان اور مہذب کام ہے ــــ اسی لئے قرآن مجید نے ابتداء میں ہی اپنے پیغامبرؐ کو ان قولی مخالفتوں پر صبر کی تعلیم دی اور اس کی یاددہانی بعد میں بھی کرائی۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ — اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا — ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ

ان سے الگ ہو جاؤ۔ (المزمل - ۷۳-۱۰)

آپؐ کے مخالفین نے آپؐ کی ان باتوں کی حقیقت کو جھٹلایا جن کو آپ روزِ روشن کی طرح عیاں دیکھ رہے تھے۔ مذاق اڑایا، استہزا کیا، تمسخر کیا، چغلیاں کھائیں، جھوٹے الزامات لگائے، لفظوں کے علاوہ اشاروں سے بدنام کیا، پروپیگنڈہ کا ایک طوفان کھڑا کیا، آپؐ کی نیت اور اخلاص میں شک کیا، آپؐ کی باتوں کو توڑا مروڑا۔ ان کو غلط معنی پہنائے، ضد کی، ہٹ دھرمی کی، جھوٹے الزامات لگائے، لوگوں کو بدگمان کیا ــــ

لیکن ان میں کوئی چیز آپؐ کو اپنے مقام سے اور اپنے کام کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔ آپؐ نے اپنے ذہن کو قابو میں رکھا، اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔ اس کو بُرائی کا جواب بُرائی سے دینے سے بچایا۔ اور اپنی راہ پر گامزن رہے۔

صبر کی نوعیتیں

اپنے یقین و ایمان پر قائم رہنے اور اپنے کام میں لگے رہنے کے علاوہ آپؐ نے ان کڑی آزمائشوں کے مقابلہ میں پورے صبر کی جو روش اختیار کی وہ کئی نوعیت کی تھی۔

اوّل تو آپؐ نے ان مخالفین سے اعراض کیا۔ ان کے ساتھ بحثوں، جھگڑوں اور جواب در جواب کے سلسلوں میں اُلجھنے سے انکار کر دیا۔ ان کے پاس سے ہٹ گئے۔ ان کے سامنے سے اٹھ گئے۔ اس لئے کہ ان جھگڑوں اور بحثوں سے قبول حق کا دروازہ نہ کھلتا اور صرف آپؐ کا وقت ضائع ہوتا۔ اور تمسخر و استہزا کی نشستوں میں شریک رہنا دین کے لئے اور آپؐ کے اپنے لئے نقصان دہ ہوتا۔

دوم، ایسے لوگوں سے دوستی اور قلبی تعلق کا تو سوال ہی نہ تھا لیکن جب آپؐ ان سے الگ ہوتے تو لڑائی جھگڑے، دشمنی اور عناد کے ساتھ نہ ہوتے۔ انسانی ہمدردی کا برتاؤ باقی رکھتے اور دعوت کا کام بھی جاری رکھتے۔ اس چیز کو قرآن مجید نے 'ھجر جمیل' (خوبصورت انداز میں چھوڑنے) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کا نقشہ 'قالوا سلاماً' (اور انھوں نے سلامتی کی دُعا کی) میں کھینچا ہے۔ اس کی ہدایت 'اَعرِض عنِ الجاھلین' (نادانوں اور مغلوب الحال لوگوں سے کنارہ کشی کرو) میں کی ہے، اسی کا حکم 'لا تقعدوا' (ساتھ نہ بیٹھو) میں دیا ہے۔

وَ اِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ	اور جاہل ان کے منہ آئیں۔ تو کہہ دیتے

ہیں کہ تم کو سلام"۔ — قَالُوا سَلٰمًا (الفرقان۔ ۲۵: ۶۳)

اور جاہلوں سے نہ الجھو — اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ (الاعراف۔ ۷: ۱۹۹)

جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے۔ اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ — وَاِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكۡفَرُ بِهَا وَيُسۡتَهۡزَاُ بِهَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ۔ (النساء۔ ۴: ۱۴۰)

اور اے نبی، جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ — وَاِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ۔ (الانعام۔ ۶: ۶۸)

اس سے بلند مقام یہ تھا کہ آپؐ نے ان کو معاف کیا، گالی کے جواب میں گالی نہ دی بلکہ دعا دی، برائی کا جواب بھلائی سے دیا۔ لیکن اس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

جب لوگ جھٹلانے پر تل جائیں، سنی ان سنی کر دیں، کبر اور حقارت کا برتاؤ کریں۔ تو رنج اور افسردگی کی ایک فطری کیفیت ہے جو ایک انسان میں ابھرتی ہے۔ اور حضورؐ کو بھی اس سے سابقہ پیش آتا تھا۔ لیکن بالآخر قرآن کی مدد سے آپؐ اس پر قابو پا لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی اور سہارے کے بعد اپنے کام میں لگے رہتے۔

اچھا جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں۔ ان کی چھپی اور کھلی — فَلَا يَحۡزُنۡكَ قَوۡلُهُمۡ ۘ اِنَّا نَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَ

سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔ | مَا یُعْلِنُوْنَ۔ (یٰسٓ۔۳۶:۷۶)

اب جو کفر کرتا ہے۔ اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے۔ انھیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے۔ پھر ہم انھیں بتادیں گے کہ وہ کیا کچھ کرکے آئے ہیں۔

وَمَنْ کَفَرَ فَلَا یَحْزُنْکَ کُفْرُہٗ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ فَنُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا۔ (لقمان۔۳۱۔۲۳)

اسی طرح مخالفین کی تدبیریں اور ہتھکنڈے، دعوتِ اسلامی کو ناکام بنانے کے لئے ان کی بھاگ دوڑ، دین کے مدعیوں کی طرف سے حمایت کفر میں تگ و دو اور کافروں سے ساز باز بھی آپ کے اندر غم اور دل شکستگی پیدا کرتا تھا اور اس کا مقابلہ بھی آپ[ص] قرآن کی مدد سے کرتے تھے۔

ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو۔ اور نہ ان کی چالبازیوں پر دل تنگ ہو۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ۔ (النحل۔۱۶:۱۲۷)

اے پیغمبر، تمہارے لئے باعثِ رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھارہے ہیں، خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں۔ ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے یا اُن میں سے ہوں جو یہودی ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاھِھِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُھُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا۔

(المائدہ۔۵:۴۱)

ایک عام نفسیاتی کیفیت "استعجال" کی تھی۔ یعنی جلدی کی خواہش، ارادہ اور قصد۔ اس کے مقابلہ کے لئے بھی بڑا صبر درکار ہے۔ بلکہ بعض تو یہی کہیں گے کہ جلد بازی نہ کرنے کا دوسرا نام ہی صبر ہے۔ اس کے مختلف پہلو تھے۔ ایک یہ کہ جب آپؐ کی ساری لگن اور محنت کے باوجود لوگ مان کر نہ دیتے، تو آپؐ کا فطری طور پر یہ دل چاہتا ہے کہ یہ جو مطالبات کر رہے ہیں، یا جو شرائط عائد کر رہے ہیں، ان میں سے کوئی مطالبہ یا کوئی شرط پوری کر دی جائے تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور یہ مان لیں۔ دوسرے یہ کہ ان سے جو وعدہ ہے تباہی اور ہلاکت کا، اس کا کچھ حصّہ ان کو نظر آجائے۔ تیسرا یہ خیال بھی اُبھرتا تھا کہ یہ قافلہ جلد از جلد منزل تک پہنچ جائے۔ ان سارے مواقع پر بھی قرآن کی ہدایات کے مطابق آپؐ نے صبر کا رویہ اختیار کیا اور نامعقول مطالبات پورا کرنے یا عذاب لانے یا نہ لانے یا منزل تک پہنچ جانے کا معاملہ سراسر اللہ تعالیٰ پر چھوڑ کر اپنے کام میں مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح کر دیا کہ آزمائش اور جدوجہد سے الگ ہٹ کر کوئی راہ کامیابی کی نہیں۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ	اے نبیؐ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں۔ ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں۔ مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انھیں پہنچائی گئی ہیں۔

انھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا۔ اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی۔ تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا۔ لہذا نادان مت بنو۔

بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ

(الانعام۔ ۶:۳۳-۳۵)

پس اے نبیؐ، صبر کرو۔ جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف۔ ۴۶:۳۵)

پس اے نبیؐ، صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اپنے قصور کی معافی چاہو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ۔

(المومن۔ ۴۰:۵۵)

اور اے نبیؐ، تم اس ہدایت کی

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

پیروی کیے جاؤ۔ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جارہی ہے اور صبر کرو یہاں تک اللہ فیصلہ کردے۔

وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۔

(یونس ۔ ۱۰ : ۱۰۹)

مقابلہ اور جہاد

جن لوگوں نے مخالفت پر کمر باندھی، قولی اور عملی دشمنی کی، یہاں تک اتمام حجت ہو گیا کہ وہ مان کر نہیں دیں گے۔ گھروں سے نکالا۔ تلوار اٹھائی۔ تحریک و دعوت کے مٹانے کی کوشش کی۔ سازشوں کے جال پھیلائے۔ یا جنھوں نے دعوائے ایمان کے باوجود ان کا ساتھ دیا اور پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے کی کوشش کی۔ حضورؐ نے ان کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا اور ان کے خلاف جہاد کیا۔ ایسا نہ کرنا اس مقصد کی شکست اور نقصان پر منتج ہوتا جو آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی آپؐ کہیں زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے نہ حد اعتدال سے گزرے۔ تلوار بھی اٹھائی تو اخلاق و انصاف کی ساری حدود ملحوظ رکھیں۔

پس اے نبیؐ، کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔

(الفرقان ۔ ۲۵ : ۵۲)

اے نبیؐ، کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ

(التوبہ ۔ ۹ : ۷۳ اور التحریم ۔ ۶۶ : ۹)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرہ۔۲: ۱۹۰)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے۔ کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (المائدہ۔۵: ۸)

جن مخالفین کی حالتِ مخالفت، دشمنی، قتال اور سازش تک نہ پہنچی یا جن پر اتمام حجت نہ ہوا۔ ان سے حضورؐ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی اصلاح کی کوشش میں لگے رہے۔ ان کا شمار جاہلین میں تھا۔ یعنی جو نادان تھے یا سمجھنے سے قاصر یا جذبات سے مغلوب۔

حسنِ اخلاق

لیکن ان دونوں گروہوں کے ساتھ معاملہ میں جو اہم بات ہے وہ یہ کہ آپؐ نے کبھی گالی نہیں دی۔ تمسخر نہیں اڑایا۔ استہزا نہیں کیا۔ ذلت و حقارت کا برتاؤ نہیں کیا۔ نجی محفلوں میں بیٹھ کر پھبتیاں نہیں کسیں۔ طعن و طنز میں نہیں لگے۔ حتیٰ کہ کبھی کوئی ناشائستہ لفظ اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بتوں اور جھوٹے خداؤں تک کو بُرا بھلا نہ کہا۔ حالانکہ ان پر تنقید پوری کی۔ اور سرداروں اور علماء یہود پر تنقید میں بھی جو زبان قرآن نے استعمال کی ہے۔ وہ اس زبان کے مقابلے میں بہت نرم ہے جو بائبل میں اسرائیلی پیغمبروں حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے استعمال کی ہے۔ اس طرح آپؐ نے کبھی کسی سائل حق کو نہیں جھڑکا۔ کسی سے ترش روئی اور تند خوئی سے پیش نہ آئے۔ کسی کے لئے

گال نہ پھلائے، تیوری نہ چڑھائی۔ اور اس معاملہ میں بھی آپ کی روش قرآن کی تعلیمات کا سچا اور مکمل نمونہ تھی۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰٓ اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔

(الحجرات۔۴۹: ۱۱)

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمٰن۔۳۱: ۱۸)

اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ۔۹۳: ۱۰-۱۱)

اور اے مسلمانو، یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں۔ انھیں گالیاں نہ دو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

(الانعام۔۶: ۱۰۸)

برائی کے بدلہ بھلائی

حقیقت یہ ہے کہ اپنے مخالفین کے ساتھ برتاؤ میں آپؐ اس سے بھی بدرجہا زیادہ اونچے مقام پر فائز تھے۔ آپؐ رحمۃ للعالمین تھے، سراپا شفقت و نرمی تھے۔ جو آپؐ کے ساتھ زیادتی کرتے تھے ان کو آپؐ معاف فرما دیتے تھے۔ جو آپؐ کا خون بہاتے آپؐ ان کے لئے دُعا فرماتے۔ جو آپ کے ساتھ بُرائی کرتے آپؐ ان کے ساتھ بھلائی کرتے۔ اور اس طرح بھی آپؐ کی سیرت قرآن مجید کی ہدایات کا نمونہ ہے۔

اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو۔	وَخُذِ الْعَفْوَ (الاعراف: ۱۹۹)
بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے۔ اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔	وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ (الشوریٰ۔ ۴۲:۴۰)
اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔	وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ (حٰمٓ السجدہ۔ ۴۱:۳۴)

واقعہ طائف

اس موقع پر سیرت سے ایک واقعہ سامنے رکھنا چاہئیے اور وہ آپؐ کے طائف کے سفر

کا واقعہ ہے۔ مکہ میں جب اکثریت نے آپؐ کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور اس بات کا امکان نہ رہا کہ وہ دعوتِ اسلامی کا مرکز بن سکے۔ تو آپؐ طائف تشریف لے گئے کہ شاید طائف وہ مرکز فراہم کر دے جہاں آپؐ کو اپنے لئے اور اپنی دعوت کے لئے ایک گوشۂ زمین مل جائے۔ جہاں آپؐ کی امت کی تشکیل ہو سکے اور جہاں خدا کا دین پورا کا پورا قائم ہو سکے۔

طائف کے تینوں سرداروں نے آپؐ کا استقبال بڑی تحقیر کے ساتھ کیا۔ ایک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے علاوہ کوئی اور نہ ملا تھا اپنا رسول بنانے کے لئے۔ دوسرے نے کہا کہ تمہارے جیسے شخص کے رسول بنانے سے کعبہ کا پردہ پھٹ نہ گیا۔ تیسرا بولا کہ اگر تم سچے ہو تو میں اس لائق نہیں کہ تم سے بات کروں اور اگر تم جھوٹے ہو تو تم اس لائق نہیں کہ مجھ سے بات کرو۔ دھتکار کر نکال دینے کے بعد تینوں نے حضورؐ کے خلاف بازاری لونڈے لگا دیئے، جنھوں نے آپ کو گالیاں دینا اور پتھر مارنا شروع کر دیا۔ خون مبارک بہہ کر جوتے میں جم گیا۔ بالآخر آپؐ نے ایک باغ میں پناہ لی۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے۔ ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ آیا۔ آپؐ سے عرض کیا کہ یہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے ساتھ ہے، اگر حکم ہو تو یہ طائف کی بستی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دے۔ حضورؐ نے جو کچھ جواب میں ارشاد فرمایا وہ آپؐ کی داعیانہ صفات کا کمال تھا۔ فرمایا کہ نہیں، کہ میں اس بات سے مایوس نہیں ہوں کہ اس قوم میں اللہ کی بندگی کرنے والے پیدا ہوں۔

دراصل یہی اخلاق کریمانہ تھا کہ لوگ پروانہ وار آپؐ کی طرف کھنچ کر آئے اور جمع ہو گئے۔ یہی اخلاق کی بلندی تھی، جس کی وجہ سے آپؐ اس بات میں کامیاب ہوئے کہ مخالفوں کے دل فتح کر لیں۔ غزوۂ احد کے موقع پر اُن کو جنھوں نے آپؐ کا خون بہایا، فتح مکہ کے موقع پر ان کو جنھوں نے زندگی بھر آپؐ کو ہر قسم کی ایذا پہنچائی، واقع افک میں ان کو

جنھوں نے آپؐ کی محبوب بیویؓ پر تہمت دھری، ان سب کو آپؐ نے اپنے دامنِ رحمت میں سمیٹ لیا۔

جن لوگوں نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا۔ ان میں ایک گروہ تو ان کا تھا جنھوں نے دعوت کو سنا، قرآن ان کے کانوں تک پہنچا اور وہ ایمان لے آئے۔ میرے محدود علم کی حد تک ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ایک گروہ ان کا تھا جنھوں نے داعی کو دیکھا، داعی کے اخلاق کو دیکھا، داعی کی سیرت دیکھی، چہرہ دیکھا، تو کہا یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ فیاضی دیکھی تو دنگ رہ گئے۔ عالی ظرفی دیکھی تو دل کھنچ گئے۔ اور اس طرح ایمان لے آئے۔ ان کی تعداد ہی کثیر تھی۔ دعوتِ اسلامی کو سربکف جانثاروں کا جو گروہ ملا، وہ داعی کی بے پناہ شخصیت کے مقناطیس نے جمع کیا تھا۔

آپؐ اور رفقائے دعوت

کسی عقیدہ اور مقصد پر مسلمانوں کو جمع کر لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن کہیں زیادہ مشکل کام اُن کو جمع رکھنے کا کام ہے۔ یعنی اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا، شیرازہ بندی کر کے ایک وحدت بنا دینا، مزاج میں ہم آہنگی پیدا کرنا، جذب و لگن کو برقرار اور زندہ رکھنا، سرد و گرم میں اپنے مقصد پر قائم رکھنا اور اپنی راہ پر آگے بڑھانا۔ افتراق و انتشار ہر اجتماعی وحدت میں آسانی سے گھس کر اس کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اور ایک قائد کا کمال یہ ہے کہ وہ دعوت پر لبیک کہنے والوں کو دعوت پر مجتمع رکھے۔

دعوت کی اپنی کشش اور داعی کے اخلاق کے علاوہ، حالات کا دباؤ، تقریر، تحریر، نعرے بھی بھیڑ جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بھیڑ کو ایک اجتماعی قوت میں بدل دینا اور اس قوت سے اس طرح کام لینا کہ اوّل اور آخر ساتھ چلنے والے اپنے قائد کے والہ و شیفتہ رہیں، ایک بالکل مختلف نوعیت کی شخصیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بہترین نمونہ ہے۔ انسانوں کو جمع کر کے ان سے کام دوسرے لیڈروں نے بھی لیا ہے۔ حق کے لئے بھی لیا ہے اور باطل کے لئے بھی۔ لیکن عام طور پر ساتھ کام کرنے والوں نے کسی نہ کسی مرحلہ پر کسی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ صرف آپؐ کے ساتھی اور متبعین آپؐ کے دور میں بھی، اور آج ۱۴۰۰ برس بعد تک بھی آپؐ

کے اسی طرح گرویدہ رہے ہیں اور آپؐ سے اسی طرح بے پناہ محبت کرنے والے رہے ہیں جس طرح کہ روزِ اوّل تھے۔

رؤف رحیم

یہ کس چیز کا اعجاز تھا؟ اس لحاظ سے بھی آپؐ کے اسوہ کے گوناگوں پہلو ہیں جن کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، اور ان میں سے بعض کا تذکرہ ہم کریں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپؐ کے اس پورے اسوہ کے سارے پہلوؤں کو دو الفاظ میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ وہی الفاظ جو قرآن نے آپؐ کے لئے استعمال کئے ہیں یعنی آپؐ اپنے ساتھیوں کے لئے، مومنین کی جماعت کے لئے رؤف رحیم تھے۔

دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول	لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ
آیا ہے۔ جو خود تم ہی میں سے ہے تمہارا	مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ
نقصان میں پڑنا، اس پر شاق ہے۔	عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ
تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔	عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ
ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق	رَّحِيْمٌ۔
اور رحیم ہے۔	(التوبہ۔ ۹ : ۱۲۸)

یہ وہ الفاظ ہیں جو صفاتِ الٰہی کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں ـــــ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و برتاؤ اور آپؐ کی صفات کے لئے وہی الفاظ استعمال کر دیئے جو اس نے خود اپنے لئے کئے ہیں۔ اس سے جہاں اللہ تعالیٰ کی حد تک انسانی زبان کی تنگ دامنی ظاہر ہوتی ہے، وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حد تک آپؐ کی شان اور رفعت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ سارے

انسانوں اور مخلوقات کے لئے آپؐ کے وجود، آپؐ کے کارنامہ رسالت و ہدایت، انذار و تبشیر، دعوت الی اللہ اور قیام قسط اور آپؐ کے اخلاق کریمانہ کو قرآن مجید نے سمیٹ کر ایک ہی لفظ سے ادا کیا ہے : رحمۃ العالمین۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپؐ کے تعلق اور روش کے جس پہلو کو چاہیئے دیکھ لیجئے۔ جس زاویہ سے چاہیئے نظر ڈال لیجئے۔ جس رنگ کو چاہیئے اُبھار لیجئے۔ تصویر ایک ہی بنے گی۔ سراپا شفقت۔ سراپا رحمت۔ اسی طرح ان دونوں الفاظ کو وسعت دیجئے، تو ہر صفت اور ہر اخلاق ان میں سما جائے گا۔ ساتھیوں سے محبت، ان کی قدر، ان کی بھلائی کی حرص، ان کی خدمت، ان کا تزکیہ، ان کی تعلیم، ان سے مشورہ، ان کے ساتھ عفو و درگزر اور یہاں تک کہ ان کی تادیب و تعزیر بھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے بھی اسم ذات کے طور پر اگر کسی دوسرے لفظ کو استعمال کیا ہے تو وہ رحمٰن کا لفظ ہے۔ اور صفت رحمٰن بھی اس کی تقریباً ہر صفت کا احاطہ کرتی ہے خواہ وہ خالقیت ہو یا رزاقیت، وہ علم ہو یا قدرت، امن و سلام ہو یا جبروت و ملکوت۔ اور پھر بات یہ ہے کہ اگر رحمٰن کا رسول، رؤف رحیم نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

قرآن مجید کی اس آیت میں ہی آپؐ کی سیرت کے ان دونوں جامع پہلوؤں کی تشریح ہوتی ہے۔ رؤف میں منفی یعنی رفع شر اور دفع مضرت کا پہلو غالب ہے۔ یعنی وہ مہربانی جو کسی ایسی چیز میں نہ ڈالے، کسی ایسی چیز کو برداشت نہ کرے، ہر ایسی چیز کو دفع کرنے میں لگ جائے جو تکلیف و مشقت، نقصان یا آزار کا باعث ہو سکتی ہو۔ اور رحمت میں مثبت یعنی عطائے خیر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی وہ مہربانی و بھلائی جو نفع، ترقی، کامیابی اور بہتری کے دروازے اور راہیں کھولے۔

جو بات قرآن واضح کرتا ہے۔ اور جو ساری حیات طیبہ میں نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ

پہلے پہلو سے آپؐ کی مہربانی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ہر وہ چیز جو آپؐ کے ساتھیوں کے لئے کسی طرح بھی نقصان کا باعث ہو سکتی تھی، وہ آپؐ کو اس درجہ شاق تھی کہ اس میں آپؐ کے دل کی کیفیت اور عملی برتاؤ کے لئے عزیز کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو ہر چیز پر غالب ہو۔ جس میں نہ صرف یہ بات شامل ہے کہ آپؐ کے کسی قول اور کسی فعل سے کبھی کسی کو کسی قسم کی کوئی ایذا نہیں پہنچی۔ آپؐ نے کسی کو برا بھلا نہیں کہا، کسی کی تحقیر نہیں کی، کسی پر بہتان نہیں لگایا، کسی کی غیبت نہیں کی، کسی کی عزت کو نقصان نہیں پہنچایا، کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ وہاں یہ بھی شامل ہے، کہ دین کے مطالبات، تحریک کی ذمہ داریوں اور شریعت کے احکام میں بھی آپؐ نے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جو مشقت اور تکلیف میں ڈالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان قربانیوں کی دعوت شامل نہیں جو دنیا اور آخرت میں فوز و فلاح کے دروازے کھولنے والی تھیں۔

اور دوسرے پہلو سے آپؐ کی کیفیت کا جو عالم تھا، اس کی تعبیر حرص سے ہی کی جا سکتی ہے۔ بھلائی، خیر، اور ترقی کے لئے ہر بات کہنا اور ہر کام کرنا، یہاں تک کہ کسی طرح دل نہ بھرے، کوئی چیز چھوٹ نہ جائے۔ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو، ہر لمحہ فیض جاری رہے۔ ہر وقت اس کی دھن تھی۔ ہر وقت آپؐ اس کی فکر میں رہتے تھے، یہی لالچ کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہی آپؐ کی کیفیت تھی۔

ان دونوں صفات کے سانچہ میں دل بھی ڈھلا ہوا تھا، اور عمل بھی۔ یہ پھوٹ کر جن صورتوں میں ظاہر ہوئیں، جو برگ و بار لائیں، ان کا شمار ممکن نہیں۔ لیکن چند اہم صورتوں سے جو روشنی پھوٹ رہی ہے اس سے اپنے دل اور اپنی راہیں منور کرنا ضروری ہیں۔ ہر ساتھی قیمتی تھا اور آپؐ نے دنیا کی ساری زینت سے نگاہ ہٹا کر خود کو صرف ان کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ ان کی تعلیم اور تزکیہ میں ہمہ دم مشغول رہتے تھے۔ ان کے ساتھ نرمی و

شفقت کا برتاؤ تھا۔ ہر ساتھی سے اس کی استعداد کے مطابق معاملہ کرتے تھے۔ مشورہ میں وہ پورے شریک تھے اور غلطیوں پر چشم پوشی، درگزر اور عفو کا شیوہ تھا۔

قدر و قیمت کا احساس اور ربط

جو شخص بھی بندگی رب کی راہ پر آپؐ کے ساتھ آیا، جس نے آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر پیمانِ وفا باندھا، جو سب کو چھوڑ کر آپ کے پیچھے چل پڑا، جس نے آپؐ کی دعوت ایمان وجہاد پر لبیک کہا، وہ آپؐ کے لئے سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ اس کی جگہ آپؐ کے دل میں تھی۔ اس کے ساتھ آپؐ کا رشتہ محبّت کا تھا۔ اس کے ساتھ آپؐ نے اپنے کو جوڑ لیا تھا۔ اس میں نہ کوئی غرض تھی نہ کوئی ہوائے نفس کہ ان سے آپؐ کا دل بالکل پاک تھا۔ یہ ساتھی آپؐ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کو چھوڑ کر یا نظر انداز کر کے آپ نے دنیا کی کسی زینت کی طرف، کسی نفع اور فائدہ کی طرف، کسی جاہ اور شہرت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا۔

اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو۔ جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو۔	وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف ۔ ۱۸ : ۲۸)

وجہ صاف اور ظاہر ہے۔ ان کے ساتھ رشتہ اس ذات کی خاطر تھا جس کی رضا اور توجہ آپؐ کا مقصد زندگی تھی۔ اِس رشتے کے آگے دنیا کی ہر شے ہیچ تھی۔ یہ تعلق

ایک وقتی ضرورت نہ تھا کہ جب چاہا قائم کرلیا، جب چاہا توڑ دیا، جب چاہا سر آنکھوں پر بٹھایا، جب چاہا اٹھا کر نیچے پھینک دیا اور پامال کردیا۔ یہ بندھ جانا اور یہ قدر وقیمت کا احساس ہی آپؐ کی نرمی اور شفقت کا ایک بڑا سرچشمہ تھا۔

یہ تعلق رب کے نام کی وجہ سے اپنی جگہ خود ہی بیش بہا تھا۔ لیکن آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا سب سے بڑا ذریعہ مومنین کی وہ جماعت ہی ہے، جو آپؐ کے ہمراہ تھی۔ وہ جتنی مضبوطی سے الفت کے سیمنٹ میں جڑی ہوگی، اتنی ہی آپؐ کے مقصد کی کامیابی یقینی ہوگی۔ اور ان کی باہمی الفت' اس الفت کا مظہر ہوگی جو ان کے قائد کو ان کے ساتھ ہوگی ___ آپؐ کو مومنین کی جماعت کا یہ درجہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی رفاقت کے ذریعہ ہی آپؐ کو کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ اور یہ وہ انعام خداوندی ہے جو اس کے فضل سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی انسان کے بس سے باہر ہے۔

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دئے ___ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کرڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے۔ مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے۔ یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔	هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ___

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ

اے نبیؐ، تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔

حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(الانفال ۸ : ۶۲-۶۴)

آپؐ کے اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ عرب کے قبائلی نظام میں، رنگ و نسل اور حسب و نسب کے سارے بت توڑ کر آپؐ نے تاریخ انسانی کا یہ حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا کہ عقیدہ او ر عمل کی بنیاد پر ایک برادری اور اُمت پیدا کر دی، ایسی برادری اور امت جس کو ۱۴۰۰ سال میں بھی مٹایا نہیں جا سکا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ یہ معجزہ بھی ہے کہ ان لاتعداد افراد میں سے جو آپؐ کے ساتھ آئے، کوئی آپؐ کا مخالف نہیں ہو گیا، کسی نے آپؐ پر الزام تراشی کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔

آپؐ نے سب کو اپنی محبت کے سایہ میں اس طرح سمیٹ لیا جس طرح ایک پرند سمیٹ لیتا ہے۔ ان کی حفاظت کی۔ ان کو پروان چڑھایا۔ بالآخر ان کو پرواز کے لائق بنا دیا۔

اور ایمان والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں، ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(الشعراء ۲۶ : ۲۱۵)

تعلیم اور تزکیہ

تعلیم و تربیت تو آپؐ کے بنیادی فرائض تھے۔ لیکن جس طرح آپؐ نے اپنے رفقائے دعوت کے درمیان اس کا فیض عام کیا۔ اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ تلاوتِ آیات کے ذریعہ ان کو چلتا پھرتا قرآن بنا دیا۔ تعلیم کتاب و حکمت کے ذریعہ ان کو علم و دانائی

اور اطاعت کا مجسمہ بنا دیا۔ اور تزکیہ کے ذریعہ ان کے نفوس کو ہر آلودگی سے پاک کر کے معراج انسانیت پر پہنچا دیا۔ مکہ کی زندگی بھی شاہد ہے اور مدینہ کی بھی کہ دعوت کے بعد اگر آپؐ کی توجہ اور فکر کسی کام پر مرکوز تھی تو وہ یہی کام تھا۔

راتوں کو قیامِ لیل اور ترتیل قرآن میں رفقاء کی ایک جماعت آپؐ کے ساتھ شریک بھی ہوتی تھی۔ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (اور ایک جماعت ان میں سے جو تمہارے ساتھی ہیں۔ المزمل) اس کا ایک مرکز دار ارقم تھا۔ جہاں آپؐ قیام پذیر ہوئے تھے اور علم و ہدایت کے پیاسے آپؐ کے چشمہ سے سیراب ہوتے تھے۔ قرآن پڑھتے تھے۔ قرآن سیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی شاید کوئی نظام تھا جس کی تفصیلات ہمیں سیرت کی کسی کتاب میں تو نہیں ملتیں، لیکن جس کی طرف قرآن نے واضح اشارہ کیا۔ کہ آپؐ خود بھی تلاوتِ قرآن کے لئے قیام فرماتے اور اپنے رفقاء کے درمیان چل پھر کر ان پر نگاہ بھی رکھتے اور ان کی خبر گیری فرماتے۔ گویا توجہ اور نگرانی کے ساتھ آپؐ یہ کام کر رہے تھے۔

جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جب تم اُٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے ہیں۔

اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔

(الشعرا۔ ٢٦: ٢١٨۔٢١٩)

آپؐ کا کام صرف قرآن سنا دینا یا اس کی قرأت کر دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کو سمجھانا اور فکر و عمل میں جذب کرانا تھا۔ اس مقصد کے لئے آپؐ تھوڑا تھوڑا قرآن سکھایا کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا بیان ہے کہ ہم نے سورۂ بقرہ آپؐ سے دس سال میں پڑھی۔ ایک اور صحابی کا بیان ہے کہ ہم حضور سے چند آیات سیکھتے

،اور ان کو محفوظ کر لینے کے بعد مزید سیکھتے۔ قرآن خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے اترا ہے۔
اور اسی طرح آپؐ نے اس کو سکھایا اور پڑھایا اور اس کی حکمت تعلیم بالکل
واضح ہے۔

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) تدریج اتارا ہے۔	وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۔ الاسراء۔ ۱۷:۱۰۶
منکرین کہتے ہیں" اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟" ہاں ایسا اس لئے کیا گیا ہے۔ کہ اس کو اچھی طرح تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لئے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔	وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ (الفرقان۔ ۲۵:۳۲)

ایک طرف قرآن کی ترتیل کے ساتھ تلاوت کہ وہی علم کا منبع تھا، بالخصوص رات کی گھڑیوں میں، اور دوسری طرف عبادات کا نظام، بالخصوص نماز کا کہ انہی پر دین و ریاست کی عمارت قائم ہونا تھی۔ ان دو ذرائع سے آپؐ نے اپنے رفقاء کے ذہن کی تعمیر کی۔ اخلاق کو بلند کیا، کردار بنایا۔ اور یہ کام آپؐ آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔ ذکر

کے پورے نظام کو زندگی میں سمو دینے کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

علمی روحانی اور اخلاقی تعلیم و تزکیہ کا یہ کام خود اپنی جگہ، کسی خلا میں، بالکل ناکافی ہوتا اگر اس کے ساتھ ساتھ آپؐ اپنے رفقاء کو عملاً دعوت و جہاد کے میدان کارزار میں نہ اُتار دیتے اور ہر قسم کی آزمائشوں کی بھٹی نہ سلگ جاتی جو ان کو تپا تپا کر کھوٹ اور میل نکال کر، کندن بنانے کا کام کرتی، ویسے بھی روحانی اور اخلاقی تزکیہ از خود مطلوب نہ تھا۔ باطل خداؤں کو چیلنج کر کے، باطل نظام پر تنقید کر کے حاکمیت اور اقتدار صرف خدا کا ہونے کا اعلان کر کے اور اپنی مکمل اطاعت (اطیعون) کا مطالبہ کر کے آپؐ نے تزکیہ کا اصل مدرسہ کھول دیا اور ہر قدم پر اپنے رفقاء کے دلوں میں یہ بات بٹھائی کہ کامیابی کی منزل انہی جاں گسل وادیوں کے درمیان گزرتی ہے، کہ ایمان کا دعویٰ ضرور پرکھا جائے گا، کہ طیب کو خبیث سے ضرور ممتاز کیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غلبہ عطا فرمائے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ۔	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا، حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں۔ جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں۔ اور جھوٹے کون۔
(العنکبوت۔ ۲۹: ۲-۳)	
مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ	اللہ مومنوں کو اس حالت میں

الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ

ہرگز نہ رہنے دے گا۔ جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔

(آل عمران۔ ۳: ۱۷۹)

قرآن، نماز اور دعوت وجہاد کی چلتی پھرتی خانقاہوں اور دوڑتے بھاگتے مدرسوں میں تعلیم دے کر آپؐ نے وہ گروہ تیار کیا جس کا تعلق اپنے رب سے مضبوط اور گہرا تھا۔ جس کا ربط اپنے بھائیوں سے گہرا اور محبّت کی چاشنی سے لبریز تھا۔ جس کی لگن اپنی دعوت اور اپنی تحریک سے انمٹ اور لازوال تھی۔ اور جس کا دردوسوز انسان کے لئے دِل کی گہرائیوں میں اُترا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ آپؐ نے تین باتوں کا اور اہتمام فرمایا۔ ایک یہ کہ للّٰہیت واخلاص پیدا ہو۔ جو کریں صرف اپنے رب کے لئے کریں۔ ابتغاء مرضات اللہ مقصود ہو۔ ہر قدم لوجہ اللہ اُٹھے۔ دوسرے یہ کہ مال کی قربانی دیں۔ اس لئے کہ مال کی محبّت سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی فتنہ نہیں۔ اس ضمن میں آپؐ نے دنیا میں رہ کر دنیا سے دل کو بے نیاز رکھنا سکھایا۔ دُنیا کو ٹھیک کرنے کے مشن سے سرشار ہونے کے باوجود اپنے لئے دنیا کو متاع قلیل اور متاع غرور سمجھنا دل میں نقش کیا۔ اور تیسرے یہ کہ نگاہوں کو آخرت کے اجر پر جمایا۔ اس کو ایک حقیقت بنا دیا۔ اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ سمجھ میں آگیا کہ وہی بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ ان تین چیزوں کے لئے ایک طرف قرآن کے حصّے پے درپے نازل ہوتے رہے۔ دوسری طرف آپؐ کی مجلسیں بھی ان کے ذکر وتاکید سے تازہ رہتی تھیں۔

نگرانی اور احتساب

ایک قائد اور معلم کو اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کی کوتاہیوں، لغزشوں اور خامیوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ بڑی بڑی غلطیوں اور گناہوں کے ساتھ آپؐ نے جس طرح عفو کا برتاؤ کیا، وہ تو بعد میں آئے گا۔ لیکن اس ضمن میں آپؐ کے بعض اصول بڑے ہی قیمتی اور جماعت کی زندگی اور اصلاح کے لئے اکسیر کا حکم رکھتے تھے۔

آپؐ اپنے ساتھیوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی ٹوہ نہ لگاتے تھے۔ اس مقصد کے لئے آپؐ نے کوئی جاسوسی کا نظام نہ قائم کیا تھا۔ حتی الوسع آپؐ کی خوشی اس میں تھی کہ یہ چیزیں آپؐ کے علم میں نہ آئیں اور لوگ خود ہی اپنی اصلاح کرلیں۔ آپؐ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ لوگ اپنے بھائیوں کے بارے میں آپؐ کے حضور شکایات پیش کریں۔ یا ان کی خرابیوں سے آپؐ کو مطلع کریں۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بدگمانی بھی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جب تک کوئی بات کھل کر نہ آجاتی اچھا گمان رکھتے۔ پیٹھ پیچھے مجلسوں میں ان کی برائیاں بھی نہ کرتے۔

غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے کسی تذلیل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اصل چیز خدا اور اس کے رسُول سے وفاداری تھی۔ اس کے بعد کوئی شخص صرف گناہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے حقیر نہ سمجھا جاتا تھا۔

پھر اگر کوئی بات آپؐ دیکھ لیتے تو مناسب انداز میں نصیحت فرماتے ۔ انتہائی شفقت ملحوظ رکھتے۔ ایسے موقع پر چشم پوشی کرنا بھی فتنہ وفساد کا سبب بن سکتا تھا۔ اصلاح میں آپؐ کی شفقت اور حکمت کی ایک جھلک ایک معمولی سے واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس سے اہم تر مواقع پر اس کا اطلاق اور کتنا.

زیادہ تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص مسجد نبوی میں آیا اور صحن میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ حاضرین اس کو روکنے اور شاید جھڑکنے اور مارنے کے لئے دوڑے حضورؐ نے سب کو روک دیا اور فرمایا کہ اب پہلے اس کو فارغ ہو لینے دو۔ جب وہ فارغ ہو گیا۔ تو آپؐ نے اپنے پاس بلا کر اس کو سمجھایا کہ یہ خدا کا گھر ہے جہاں گندگی پھیلانا منع ہے۔ پھر صحابہؓ کو حکم دیا کہ اس کو صاف کر کے پانی بہادیں۔

جب کسی فرد کی کوئی غلطی آپؐ کے علم میں آتی تو آپؐ اس کا ذکر کسی مجلس میں نہ فرماتے۔ نہ اس کا نام لے کر مخاطب فرماتے، ٹوکتے اور شرمندہ کرتے۔ بلکہ عموماً یوں کہتے کہ لوگوں کا حال کیا ہوگا۔ کہ وہ ایسا اور ایسا کرتے ہیں۔ (فَمَا بَالُ قَوْمٍ.....)

ایسا بھی نہ تھا کہ آپؐ کی تعلیم، سرزنش، تعزیر، تادیب اور احتساب سے خالی ہو ____ ایک صاحب نے اونچا گنبد تیار کر لیا۔ تو آپؐ نے ان کے سلام کا جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کو مسمار دیا۔ ایک اور شخص نے نماز جلدی جلدی گنڈے دار طریقہ سے ادا کی تو اس کو اسی طرح سرزنش کی۔ جہاں حدود کا نفاذ ضروری تھا، حدود نافذ کیں۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر تین اصحاب کے اوپر پچاسؓ روزہ سوشل بائیکاٹ نافذ کیا۔ کفارہ کا طریقہ بھی رائج کیا۔ صدقہ اور مال لے کر بھی تطہیر و تزکیہ کا عمل کیا۔

لیکن آپؐ کا احتساب ایک تھانیدار اور سخت گیر حکمراں کا احتساب نہ تھا۔ آپؐ کی نگرانی ایک شفیق باپ اور معلم کی نگرانی تھی۔ اور آپؐ کی اصل کوشش ہمیشہ یہی رہی، اور اسی کی آپؐ نے تعلیم دی، کہ لوگ خود اپنا احتساب کریں۔ اپنے رب کے سامنے جواب دہ سمجھیں اور اس سے ہی استغفار کریں۔ اور جب لوگ آکر آپؐ کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے تو آپؐ ان کو اسی راہ پر چلاتے اور خود بھی ان کے لئے

استغفار فرماتے۔

اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار	وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا
کیا ہوتا۔ کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم	اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا
کر بیٹھے تھے۔ تو تمہارے پاس آجاتے	اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ
اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول	الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا
بھی ان کیلئے معافی کی درخواست کرتا	اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔
تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے	(النساء۔ ۴: ۶۴)

والا پاتے۔

اور اسی طرح ان کی غلطیوں کا ازالہ فرماتے اور آخرت میں ان کے گناہوں کی معافی کی راہ کھولتے۔ اس لئے کہ اصل اجر آخرت کا اجر ہے اور اصل سزا وہیں کی سزا ہے۔

استعداد اور صلاحیت کے مطابق مُعاملہ

قیادت اور تعلیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت کا ایک پہلو یہ تھا کہ آپؐ ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق معاملہ فرماتے۔ اس بات کا لحاظ فرماتے کہ جو لوگ آپؐ کے ساتھ چلنے والے ہیں۔ وہ ایک قسم کے اور ایک سطح کے نہیں۔ ایمان اور وابستگی کے لحاظ سے بھی ان کے درمیان فرق ہے۔ عقل اور جسم کی صلاحیتیں بھی مختلف ہیں۔ ہر شخص مختلف کام کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ہر ایک سے یکساں مطالبات نہیں کئے جا سکتے۔ آپؐ قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالنا پسند نہ فرماتے۔ اور انسانی کمزوریوں کا الاؤنس دیتے اور ان کی بنیاد پر

اپنے ساتھیوں کو مطعون نہ فرماتے۔

ایک شخص حضورؐ کے پاس آیا، اور پوچھا کہ دین کے مطالبات کیا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ شہادت، پانچ وقت کی نماز، تیس۳۰ دن کے روزے، سال میں زکوٰۃ اور ایک حج۔ اس نے سوال کیا کہ اس کے علاوہ اور کچھ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، اور کچھ نہیں ہے۔ وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ میں اس سے نہ کمی کروں گا نہ زیادتی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جنتی کو دیکھنا ہو تو اس آدمی کو دیکھ لو۔

لیکن یہ معاملہ ہر ایک کے ساتھ نہیں تھا۔ کسی سے یہ بیعت تھی کہ آپؐ کے ساتھ گھر بار چھوڑ دیں گے، کسی سے جان و مال نذر کر دینے کا معاہدہ تھا، کسی سے سوال نہ کرنے کا عہد تھا، کسی سے غصہ نہ کرنے کا مطالبہ تھا۔ کسی کے بارے میں کہا گیا کہ جو ایمان لے آئیں اور ہجرت نہ کریں ان کا شمار مومنین میں نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مسلمان ہے لیکن بعض اُمور کا مرتکب ہونے کی صورت میں وہ ہم میں سے نہیں۔ اور کہیں اسی پر اکتفا کیا گیا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے۔ وہ ہم میں سے ہے۔

آپؐ کی اسی پالیسی کی وجہ سے مختلف النوع لوگ آپؐ کے ساتھ آئے اور آپؐ کے ساتھ چلتے رہے۔ ایمان، عمل، صلاحیت اور استعداد کے فرق کے باوجود ہر شخص خوش اور مطمئن تھا کہ وہ جو کچھ دے رہا ہے۔ وہ قبول ہو رہا ہے۔

نرم دلی اور نرم خوئی

رحمت و رافت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے لئے انتہائی نرم دل

تھے۔ قلب مبارک کی تو یہ کیفیت تھی کہ اس میں کہیں راہ حق پر ساتھ چلنے والوں کے لئے سختی، شدّت یا غفلت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ادھر آپؐ کے برتاؤ، روش، بات چیت، طرزِ عمل، معاملات میں سخت دلی، ترش روئی اور تند خوئی کا گزر نہ تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جو آپؐ کے ساتھ آیا وہ چمٹ کر رہ گیا۔ پھر اس نے آپؐ کے قدم نہ چھوڑے۔ آپؐ کے درِ کریمانہ پر آکر بیٹھ گیا تو اُٹھ کر نہ گیا۔ آپؐ کے اشارہ پر جان و مال فدا کر دینے سے دریغ نہیں کیا۔ قرآن اس تصویر کو یوں کھینچتا ہے۔

اے پیغمبرؐ، یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے، کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تند خو اور سنگ دل ہوتے۔ تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ (آل عمران - ۳ : ۱۵۸)

حضور کی نرم دلی، نرم مزاجی، نرم خوئی اور حلم کے واقعات بے شمار ہیں۔ روزمرّہ کی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی کے نازک مواقع اور بڑے سنگین مراحل میں بھی، دوستوں کے ساتھ بھی اور دشمنوں کے ساتھ بھی۔

حضرت انس بن مالکؓ برسوں آپؐ کی خدمت میں رہے۔ اور آپؐ کی خدمت میں کام کرتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ نہ آپؐ نے کبھی جھڑکا، نہ ڈانٹا۔ یہ تک نہیں کہا کہ ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا۔ ایک معمولی مسلمان، ایک بڑھیا بھی آپؐ کو راستہ میں روک لیتی اور آپؐ رُک کر اس کی پوری بات توجہ سے سنتے اور اس کی مشکل حل کرتے ــــ قرض خواہ آتے اور گلے کی چادر پکڑ کر کھینچ لیتے اور آپؐ مسکرا کر ٹال دیتے۔ ساتھی اس کو ٹوکتے تو فرماتے کہ اس کو کہنے دو، کرنے دو، اس لئے کہ اس۔

کا حق ہے۔

لوگ محفل میں آتے تو تخاطب، سلام اور گفتگو میں زبان اور الفاظ توڑ مروڑ کر آپؐ کو گالیاں دیتے اور بُرا بھلا کہتے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ آپؐ جواب نہ دیتے تھے، بلکہ نظر انداز کر دیتے تھے۔ اگر جواب دیتے تو اس طرح کہ صرف بدنیت اشخاص ہی اپنے عمل کے مطابق اس کی زد میں آتے۔ یہ معاملہ یہودی سرداروں اور علماء کا تھا۔ السلام علیک کو السام علیک بنا دیتے۔ کہ تم کو موت آئے۔ " حضورؐ نے جواب میں فرمایا۔ وعلیکم۔ حضرت عائشہ سے رہا نہ گیا، اور انھوں نے کہا، موت تمہیں آئے اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑے۔ حضورؐ نے انھیں تنبیہ فرمائی کہ اے عائشہؓ اللہ کو بدزبانی پسند نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا، رسول اللہ، آپؐ نے سنا نہیں کہ انھوں نے کیا کہا ____؟ حضورؐ نے فرمایا اور تم نے سنا نہیں کہ میں نے انھیں کیا جواب دیا؟ میں نے ان سے کہہ دیا " اور تم پر بھی "۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ تفہیم القرآن۔ جلد پنجم لاہور۔ ۱۹۷۴ء
صفحہ ۳۵۹۔ بحوالہ بخاری، مسلم

آپؐ کے حلم اور برداشت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ سے ملاقات میں، آپؐ کی مجلسوں میں اور آپ سے بات چیت میں لوگ ہر قسم کی آزادی برتتے۔ اور غیر تربیت یافتہ لوگ تو ادب اور تہذیب کی حدود پھلانگ جاتے۔ لیکن اس کے باوجود کہ آپؐ کو سخت تکلیف ہوتی، آپؐ یہ سب گوارا فرما لیتے۔ اور کوئی سخت یا نازیبا کلمہ آپؐ کے منہ سے نہ نکلتا۔ ایسے تمام مواقع پر خود وحی الٰہی نے آکر لوگوں کو صحیح آداب اور تہذیب کی تربیت دی۔

بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے تو کھانے سے فارغ ہو کر دھرنا مار کر

بیٹھ جاتے اور اس بات کی کوئی پروا نہ کرتے کہ حضورؐ کو اس سے کیا زحمت ہو رہی ہے۔ حضورؐ اس صورت حال کو بھی خاموشی سے برداشت کرتے ــــ مسلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رات کے وقت حضرت زینبؓ کے ولیمہ کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے۔ مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تنگ آکر حضورؐ اٹھے اور ازواج مطہرات کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہیں۔ آپؐ پھر پلٹ گئے۔ اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جا بیٹھے، اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپؐ کو معلوم ہو کہ وہ چلے گئے ہیں۔ تب آپؐ حضرت زینبؓ کے مکان میں تشریف لائے ''۔

(مولانا مودودی، تفہیم القرآن جلد چہارم، لاہور ۱۹۷۴ء صفحہ ۱۲۰-۱۲۱،
بحوالہ مسلم، نسائی، ابن جریر)

اس پر ہدایت آئی:۔

مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ،	فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا
باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری	وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ
یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں۔	اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی
مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں	النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ
کہتے اور اللہ حق بات کہنے میں	وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ۔
نہیں شرماتا۔	(الاحزاب۔ ۳۳: ۵۳)

یہ درجہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔

اسی طرح بعض لوگ وقت بے وقت ملاقات کے لئے آجاتے اور آپؐ کو گھر سے بلاتے۔ حضورؐ کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ مگر اپنے حلم کی وجہ سے آپؐ اس رویہ کو بھی

برداشت کرتے تھے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں۔

" جن لوگوں نے آپؐ کی صحبت میں رہ کر اسلامی آداب و تہذیب کی تربیت پائی تھی وہ تو آپؐ کے اوقات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ ان کو پورا احساس تھا کہ آپؐ اللہ کے کام میں کس قدر مصروف زندگی بسر فرماتے ہیں۔ اور ان تھکا دینے والی مصروفیتوں کے دوران میں لازماً کچھ وقت آپؐ کے آرام کے لئے اور کچھ وقت آپؐ کی اہم مشغولیتوں کے لئے اور کچھ وقت اپنی خانگی زندگی کے معاملات کی طرف توجہ کرنے کے لئے بھی ہونا چاہئیے ..... لیکن .... بارہا ایسے ان گھڑ لوگ بھی آپؐ سے ملاقات کے لئے آجاتے تھے جن کا تصور یہ تھا کہ دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے کو کسی وقت بھی آرام لینے کا حق نہیں ہے۔ اور انھیں حق ہے کہ رات دن میں جب چاہیں اس کے پاس آدھمکیں اور اس کا فرض ہے۔ کہ جب بھی وہ آجائیں وہ ان سے ملنے کے لئے مستعد رہے۔ اس قماش کے لوگوں میں عموماً اور اطراف عرب سے آنے والوں میں خصوصاً بعض ایسے ناشائستہ لوگ بھی ہوتے تھے جو آپؐ سے ملاقات کے لئے آتے تو کسی خادم سے اندر اطلاع کرانے کی زحمت بھی نہ اٹھاتے تھے۔ بلکہ ازواجِ مطہرات کے حجروں کے چکر کاٹ کر باہر ہی سے آپؐ کو پکارتے تھے" (تفہیم القرآن جلد پنجم۔ صفحہ ۷۲-۳)

اے نبیؐ! جو لوگ تمہیں حجروں	اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ
کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں	مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ
سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے	اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی	وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى
کے لئے بہتر تھا۔ اللہ درگزر کرنے والا	تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

اور رحیم ہے۔ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات۔ ۴۹:۴۔۵)

بعض لوگ ایسے تھے، جو عبدالرحمٰن بن زید اسلمی کی روایت کے مطابق۔ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دیر تک بیٹھے رہتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ آخر وقت تک بیٹھے رہیں۔ اس سے بااوقات حضورؐ کو تکلیف ہوتی تھی۔ آپؐ کے آرام میں بھی خلل پڑتا تھا۔ اور آپؐ کے کاموں کا بھی حرج ہوتا تھا" (مولانا مودودی ــ تفہیم القرآن۔ جلد پنجم صفحہ ۳۶۲۔ بحوالہ ابن جریر و ابن کثیر) لیکن حضورؐ کا تحمل اور اخلاق اس کو بھی خاموشی سے برداشت کر لیتا۔

اسی طرح ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کی مدد اور حاجت روائی کے لئے ہر وقت حاضر تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی میں ایک گھڑی صرف کرنا اپنی مسجد میں دو ماہ اعتکاف سے زیادہ محبوب ہے۔ دوسری طرف آپؐ ہر ایک کی بات کان لگا کر سنتے اور جو آپؐ سے تخلیہ میں گفتگو کا خواہش مند ہوتا، اس کی خواہش پوری فرماتے اور آپؐ کی پیشانی پر بل تک نہ آتا۔ پھر عام طور پر آپؐ مسلمانوں کی بات پر یقین بھی کرتے تھے۔ منافقین آپؐ کی اس نرمی طبع کی بنیاد پر آپؐ کو متہم کرتے۔ "کہتے تھے کہ آپؐ کانوں کے کچے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے آپؐ کے کان بھرتا ہے اور آپؐ اس کی بات مان لیتے ہیں۔" (مولانا مودودی۔ تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۲۵۹۔

ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی	وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ
باتوں سے نبیؐ کو دکھ دیتے ہیں اور	النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ
کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔	اُذُنٌ۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ
کہو وہ تمہاری بھلائی کے لئے ایسا	لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

ہے، اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور　　وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ
اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے۔ اور　　وَرَحْمَۃٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے　　مِنْکُمْ۔
جو تم میں سے ایماندار ہیں۔　　(التوبہ۔ ۹: ۶۱)

یہ بھی آپؐ کے سَراپا رحمت ہونے کا نتیجہ تھا۔ بعض لوگ اپنی بڑائی جتانے کے لئے، بعض لوگ بغیر کسی اہم ضرورت کے اور بعض لوگ واقعی اہم وجوہات کی بنا پر آپؐ سے خلوت میں بات کرنا چاہتے تھے۔" زید بن اسلمی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شخص بھی علیٰحدگی میں بات کرنے کی درخواست کرتا، آپؐ اسے رد نہ فرماتے تھے۔ جس کا جی چاہتا آ کر عرض کرتا کہ میں ذرا الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور آپؐ اسے موقع دیتے، یہاں تک کہ بہت سے لوگ ایسے معاملات میں بھی آپؐ کو تکلیف دینے لگے۔ جن میں الگ بات کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ (مولانا مودودی۔ تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۳۶۳) اس صُورت حال کی بنا ر پر نوبت یہاں آ پہنچی کہ ایک وقت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو آپؐ سے تخلیہ میں گفتگو کرنا چاہے وہ پہلے صدقہ دے۔ اگرچہ یہ حکم فوراً ہی منسوخ ہو گیا۔ لیکن آپؐ کی نرم خوئی کی عکاسی اور تعلیم کا کام پورا ہو گیا۔ (المجادلہ۔ ۵۸: ۱۲۔ ۱۳)

روزمرہ کی عام زندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی سے آگے بڑھ کر تحریک کے نازک اور سنگین عوامل اور مواقع پر بھی آپؐ کی نرم دلی اور نرم خوئی اپنے دامن میں سب کچھ سمیٹ لیتی تھی۔ مخلص ساتھیوں کی کمزوریاں اور غلطیاں ہوں یا منافقین کی سرگرمیاں۔

سورۃ آل عمران کی وہ آیت جس میں آپؐ کی نرم دلی کو اللہ کی رحمت سے تعبیر

کیا گیا ہے، غزوۂ اُحد کے موقع پر نازل ہوئی۔ جب ایک طرف منافقین کے ایک گروہ نے ہر طرح آپؐ کو اور آپؐ کی جماعت کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور دوسری طرف مومنین کا ایک گروہ بھی دُنیا کی محبت میں آپؐ کی حکم عدولی کر بیٹھا۔ اور جیتی بازی ہاتھ سے نکل گئی۔ اس موقعہ پر آپؐ منافقین سے سختی برتتے اور ان کو سزائیں دیتے اور قصور وار مومنین سے سختی سے باز پُرس فرماتے تو سیاسی لحاظ سے بالکل مناسب اور صحیح ہوتا۔ لیکن ایک گروہ سے آپؐ نے چشم پوشی فرمائی اور بالآخر ان کی کافی تعداد مخلص بن گئی۔ اور ایک گروہ کو آپؐ نے معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، وہ بالآخر اسلام کے جاں نثار سپاہی ثابت ہوئے۔ سزا کی روش اختیار کی جاتی تو یہ لوگ چھٹ جاتے۔ ان کا اللہ کی نافرمانی کی راہ پر سخت پڑ جانا یا نکل کھڑا ہونا بھی ایک ہادی کا نقصان شمار ہوتا اور ان کا ضائع ہو جانا جماعت کا بھی نقصان ہوتا۔

مگر جب تم نے کمزوری دکھائی	حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ
اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا	وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ
اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں	وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
دِکھائی۔ جس کی محبت میں تم گرفتار	مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ
تھے۔ (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے	مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا
سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔	وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ
اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا	الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ
کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی	عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ
خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے	وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ

تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔ کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(آل عمران۔ ۳ : ۱۵۲)

تم میں جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے۔ ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا۔ کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔

(آل عمران۔ ۳ : ۱۵۵)

دعوتِ اسلامی کو جس نازک جد و جہد سے سابقہ تھا۔ اس کی وجہ سے یہ بات لازم کر دی گئی تھی کہ کسی اجتماعی کام سے خصوصًا جہاد سے کوئی خود سے بیٹھ نہ جائے گا جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہ لے لے اور آپ کو اجازت دینے یا نہ دینے کا پورا اختیار دیا گیا تھا۔

مومن تو اصل میں وہی ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى

کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں۔	اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا
تو اس سے اجازت لئے بغیر نہ جائیں۔	حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ
اے نبیؐ، جو لوگ تم سے اجازت	الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ
مانگتے ہیں۔ وہی اللہ اور رسولؐ	الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
کے ماننے والے ہیں۔ پس جب وہ	وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ
اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں	لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ
تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو	لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ
اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ	لَهُمُ اللّٰهَ۔
سے مغفرت کی دعا کیا کرو۔	(النور۔ ۲۴۔ ۶۲)

لیکن آپؐ کا سلوک یہ تھا کہ ہر قسم کا عذر قبول فرما لیتے۔ واقعی مجبوریاں تو ظاہر ہی ہوتی ہیں لیکن جہاد سے پہلے یا جہاد کے بعد، منافقین جو عذرات تراشتے تھے آپؐ ان کو بھی قبول فرما لیتے۔ پیچھے رہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دیتے یا اس کی حرکت سے درگزر فرماتے اور چشم پوشی سے کام لیتے۔ قرآن مجید نے آپ کو انتہائی مشفقانہ انداز میں متوجہ کیا اور ساتھ ہی آپؐ کی صفت رحمت کی عکاسی کر دی۔

اے نبیؐ، اللہ تمہیں معاف کرے	عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ
تم نے کیوں انھیں رخصت دیدی۔	لَهُمْ۔ (التوبہ۔ ۹: ۴۳)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں۔

"چشم پوشی اور مسامحت کریم النفسی کا ایک لازمی مقتضا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح تمام اعلیٰ صفات انسانی کے مظہر تھے۔ اسی طرح آپؐ میں چشم پوشی کی صفت بھی کمال درجہ موجود تھی۔ منافقین آپؐ کی اس کریم النفسی سے ناجائز فائدہ

اٹھانے کی کوشش کرتے۔ فرائض دینی بالخصوص فریضہ جہاد سے فرار کے لئے وہ مختلف قسم کے جھوٹے عذرات تراشتے اور آپؐ کی خدمت میں پیش کر کے گھر بیٹھ رہنے کی اجازت مانگتے۔ حضورؐ ان بناوٹی عذرات سے اچھی طرح واقف ہوتے لیکن بر بنائے کریم النفسی جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔ درگزر فرماجاتے اور ان کو اجازت دے دیتے.... متنبہ کرنے کا انداز بہت دلنواز ہے۔ بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہوجائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں بلکہ توجہ دلانا ہے ....." (تدبر قرآن۔ جلد سوم۔ لاہور۔ ۱۹۷۸ء۔ صفحہ ۱۷۲۔)

جب بعض منافقین کی دشمنی کھل کر سامنے آئی۔ اس وقت بھی آپؐ نے ان کے ساتھ تحمل، بردباری، درگزر اور حکمت کا معاملہ کیا۔ ان میں سے خاص طور پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھ آپؐ کا طرزِ عمل ہے۔ جس سے آپؐ کی شانِ کریمی بھی ظاہر ہوتی ہے اور جس میں قیادت کے بہت سے قیمتی سبق پوشیدہ ہیں۔

واقعات تفصیل چاہتے ہیں۔ جن کی یہاں گنجائش نہیں (مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن۔ جلد پنجم، صفحہ ۵۲۲۔ ۵۰۸، سورۃ المنافقون۔ ۶۳) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔) لیکن اس کی ساری بدتمیزیوں، دشمنیوں، سازشوں اور غداریوں کے بعد ۶ھ میں غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر اس نے ایسے فتنے اٹھائے جو مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ ایک طرف اس نے انصار اور مہاجرین کو آپس میں لڑوانے کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف منافقین کے ساتھ مل کر یہ سازش کی کہ مدینہ پہنچ کر آپؐ کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اس نے کہا کہ" ہماری اور ان قریش کے کنگلوں (یا اصحاب محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے

نظر آئیں۔ خدا کی قسم، مدینہ واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے۔ وہ ذلیل کو نکال دے گا۔" اس واقعہ کی رپورٹ حضرت زید بن ارقم نے اس وقت جو نوجوان تھے حضور تک پہنچادی۔ عبداللہ بن ابی صاف مکر گیا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کی گردن اڑادی جائے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا " ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے۔ کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کر رہا ہے۔" آپؐ کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام انصار میں عبداللہ بن ابی کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا اور ہر طرف سے اس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ یہاں تک کہ جب یہ قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے لگا۔ تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے جن کا نام بھی عبداللہ تھا۔ تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے "آپ نے کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا۔ اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ آپ کو اجازت نہ دے دیں۔" چنانچہ حضورؐ کے کہنے پر جب حضرت عبداللہ نے راستہ چھوڑا اور تلوار میان میں رکھی۔ تو عبداللہ بن ابی مدینہ طیبہ میں داخل ہو سکا۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ امر بھی بیان کر دیا کہ ایسے منافقین کی مغفرت نہ ہو گی۔ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود استغفار کریں۔ (المنافقون ۶۳ : ۶) پھر غزوۂ تبوک کے موقع پر زیادہ شدت کے ساتھ تاکید کی۔ کہ اگر آپؐ ستّر بار بھی استغفار کریں گے تو ایسے دشمنان خدا کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

اے نبیؐ! تم خواہ ایسے لوگوں	اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ
کے لئے معافی کی درخواست کرو یا	لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ۔	نہ کرو اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کر دینے کی درخواست کروگے۔ تو (اللہ) انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔

(التوبہ - ۹ : ۸۰)

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں۔ کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت وشفقت تھے۔ اس وجہ سے ان منافقین کی تمام شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود ان کی اصلاح اور نجات، آپؐ کو اس قدر عزیز تھی کہ جس طرح آپؐ اپنی تمام اُمت کے لئے برابر خدا سے مغفرت چاہتے رہتے تھے۔ اسی طرح ان کے لئے بھی برابر نجات کی دُعا کرتے رہتے۔ (تدبر قرآن۔ جلد سوم صفحہ ۲۰۳)

یہاں تک کہ جب عبداللہ بن ابی جیسے منافق کا انتقال ہوگیا۔ تو حضورؐ کے لطف و کرم کی انتہا یہ تھی کہ اس کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ جو مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لئے آپؐ کا کرتا مانگا۔ آپؐ نے کمال فراخدلی سے عطا کر دیا۔ پھر انھوں نے درخواست کی۔ کہ آپؐ ہی نمازِ جنازہ پڑھائیں۔ آپؐ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے باصرار ذکر کیا کہ یا رسول اللہ۔ کیا آپؐ اس شخص پر نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔ جو یہ اور یہ کر چکا ہے۔ مگر حضورؐ ان کی یہ باتیں سن کر مسکراتے رہے اور اپنی اس رحمت کی بنا پر جو دوست دشمن سب کے لئے عام تھی۔ آپؐ نے اس بدترین دشمن کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرنے میں تامل نہ کیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جب سُورہ التوبہ کی آیت کا حوالہ دیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے بخشش ہو جائے گی تو میں کرتا۔ آخر جب آپؐ نماز پڑھانے

کھڑے ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (مولانا مودودی تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۲۲۰)

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا، کیوں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔

(التوبہ۔ ۹: ۸۴)

عفو و درگزر

اسی رحمت کا ظہور اسی شان عفو میں تھا جو دوست دشمن سب کے لئے عام تھی۔ اور جس کی ہدایت آپؐ کو آپؐ کی نرم دلی کے تذکرہ کے فوراً بعد ہی کی گئی تھی۔ انسان کی فطرت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کے لئے بعض اوقات دشمن کو معاف کر دینا آسان ہوتا ہے لیکن وہ اپنوں کے لئے بڑا سخت گیر بن جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیض سب کے لئے عام تھا۔ دشمنوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اپنے اگر اخلاقی اور قانونی غلطیاں کرتے تو آپؐ کی خواہش ہوتی کہ آپؐ کے علم میں نہ آئے۔ علم میں آجائے تو سزا دینے کی نوبت نہ آئے۔ سزا دینا ہی پڑے تو کفارہ پر بات ٹل جائے۔ لیکن تحریکی غلطیوں پر بھی آپؐ کا سلوک اس سے مختلف نہ تھا۔

مشہور واقعہ حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا ہے۔ جب قریش نے صلحہ حدیبیہ کا

معاہدہ توڑ دیا۔ تو حضورؐ نے فتح مکہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر چند صحابہؓ کے علاوہ کسی کو نہیں بتایا کہ قصد وارادہ کیا ہے۔ اسی زمانے میں بنی عبد المطلب کی ایک لونڈی مالی مدد کے لئے مدینہ طیبہ آئی۔ جب وہ واپس جانے لگی تو حضرت حاطبؓ اس سے ملے اور اس کو چپکے سے ایک خط بعض سرداران مکہ کے نام دیا۔ اور دس دینار دیئے تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور چھپا کر یہ خط ان لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینے سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرمادیا۔ آپؐ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ بن اسود کو اس کے پیچھے بھیجا..... ان حضرات نے خط برآمد کر لیا۔ اور یہ اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا۔ تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں.... حضورؐ آئے، حضرت حاطبؓ سے پوچھا، یہ کیا حرکت ہے ؟ انھوں نے عرض کیا۔ آپؐ میرے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس بناء پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقرباء مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلے کا آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل وعیال مکہ میں ہیں۔ ان کو تو ان کا قبیلہ بچالے گا۔ مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جسے کوئی بچانے والا ہو۔ اس لئے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کی بات سن کر حاضرین سے فرمایا قد صدقکم "حاطبؓ نے تم سے سچی بات کہی ہے"۔ یعنی ان کے اس فعل کا اصل محرک یہی تھا۔ اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اس کا

محرک نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر عرض کیا۔ یارسول اللہؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔ اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ تمہیں کیا خبر، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کردیا..... یہ بات سُن کر حضرت عمرؓ رو دیئے اور انھوں نے کہا، اللہ اور اس کے رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ (مولانا مودودی۔ تفہیم القرآن۔ جلد پنجم، صفحہ ۴۲۴، بحوالہ مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ۔)

بنیادی بات یہی تھی کہ کون اپنا ہے اور کس کا ریکارڈ کیا ہے۔ جو بنیادی طور پر اپنا ہے، وفادار ہے، نیک نیت ہے۔ اس کی زندگی وفاداری میں بسر ہوئی ہے وہ اگر اتنی بڑی غلطی کرے کہ جو کسی بھی قانون کے تحت غداری کی تعریف میں آتی ہے۔ تو وہ نرمی کا مستحق ہے۔ معاف کیا جائے گا یا نہیں یہ جماعتی حالات پر منحصر ہے۔ لیکن سزا دینے کے مقابلے میں معاف کردینا، پکڑ لینے کے بجائے چھوڑ دینا زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احتساب اور تعزیر میں بڑے نرم تھے اور معاف کردینے میں بڑے فیاض۔

مشاورت

نرمی اور معافی کے ذکر کے بعد ہی قرآن نے آپؐ کی سیرۃ کے ایک اور پہلو کو کھولا ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے تحریک کے سارے اہم معاملات میں ساری زندگی اپنے ساتھیوں کو فیصلوں میں شریک کیا۔ ان سے مشورہ کیا وشاورھم فی الامر پر آپؐ کی پوری سیرت گواہ ہے۔ بات یہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

مشورہ کے محتاج ہوں۔ ایک طرف وحی الٰہی کی ہدایت آپؐ کو حاصل تھی، دوسری طرف خود آپؐ کا سینہ مبارک علم اور فیصلہ کرنے کی صحیح استعداد اور قوت (علماً وحکماً) کے نور سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن کوئی جماعت اس وقت تک قوت نہیں حاصل کر سکتی۔ جب تک اس کے شرکاء اس کے فیصلوں میں شریک نہ ہوں۔ سیرت سے بے شمار واقعات اس کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہم صرف چند بڑے اور اہم واقعات کا ذکر کریں گے۔

مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد آپؐ کو پہلا نازک مرحلہ غزوۂ بدر کا پیش آیا۔ قوت کمزور تھی، تعداد کم تھی۔ سواریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مہاجر اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔ انصار سے بیعت یہ تھی کہ دشمن حملہ کرے گا تو جان لڑائیں گے۔ ادھر ایک طرف قریش کا قافلہ تجارت تھا اور دوسری طرف قریش کا لشکر جرار۔ دعوت و تحریک کی طویل حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ لشکر جرار سے ٹکر مول لی جائے اور کفر و باطل کی قوت کا سر کچل دیا جائے۔ مشیتِ الٰہی بھی یہی تھی۔ اور آپؐ اپنا فیصلہ سنا کر حکم دیتے تو صحابہؓ تعمیل اور جاں نثاری میں کوتاہی نہ کرتے۔ لیکن آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا۔ اور مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن عمروؓ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ، جدھر آپؐ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلئے۔ ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں۔ کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم تو کہتے ہیں کہ چلئے آپؐ اور آپؐ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپؐ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔" حضورؐ نے اب بھی فیصلہ نہ کیا یہاں تک کہ انصار میں سے حضرت سعد بن معاذؓ بولے۔ "اے اللہ کے رسولؐ، جو کچھ آپؐ نے

ارادہ کیا ہے اسے کر گزریئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ کود دیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا" اس کے بعد حضورؐ کا چہرہ چمک اُٹھا اور آپؐ نے لشکر کے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔

غزوۂ اُحد (سنہ ۳ھ) کے موقع پر جب یہ سوال پیدا ہوا کہ شہر میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے یا شہر سے باہر نکل کر تو حضورؐ نے اس اُمر کا فیصلہ بھی اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے کیا اور ایک روایت کے مطابق ان جوشیلے نوجوانوں کی اکثریت کی رائے کی بنا پر کیا جو غزوۂ بدر میں نہ لڑ سکتے تھے اور اب اپنی جاں نثاری دکھانے کے لئے بے چین تھے اور اسی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

غزوۂ احزاب (سنہ ۵ھ) کا وقت بڑا نازک تھا۔ سارا عرب امنڈ کر آیا تھا۔ ہزاروں کے لشکر نے مدینہ طیبہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، دفاع کا انتظام حضورؐ نے مشورہ کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سے خندق کھود کر کیا تھا۔ پشت پر یہودیوں کے قلعے تھے۔ اور ان میں سے کسی وقت بھی غداری متوقع تھی بلکہ قریش ان سے نامہ وپیام میں مصروف تھے اور وہ مسلمانوں سے اپنا وعدہ توڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حضورؐ نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے بنو غطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور چاہا کہ وہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا ⅓ حصہ لے کر قریش کا ساتھ چھوڑ دیں اور مسلمانوں سے صلح کر کے واپس چلے جائیں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ انصار کے سعدؓ بن عبادہ اور سعد بن معاذؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، یہ آپؐ کی اپنی خواہش ہے یا اللہ کا حکم ہے۔ آپؐ نے بتایا کہ نہیں، یہ میری خواہش ہے کہ میں تم لوگوں کو بچاؤں اور دُشمن کا زور توڑ دوں۔ دونوں

سرداروں نے کہا کہ جب ہم مسلمان نہیں تھے تو یہ قبیلے ہم سے خراج وصول نہ کر سکے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ یہ کہہ کر انھوں نے اس معاہدہ کا مسودہ چاک کر دیا جس پر ابھی تک دستخط نہ ہوئے تھے۔ بات یہ نہ تھی کہ حضورؐ میں کوئی کمزوری تھی بلکہ مشورہ لینا، وہ حکمت ودانائی کا کام تھا۔ جس کے ذریعہ صلح کے خیال کو ختم کر دینے اور لڑائی کے عزم کو زندہ وبرقرار رکھنے کا مقصد حاصل ہوا۔ لوگ پختہ ہو گئے اور ایک نئی قوت ان کے اندر پیدا ہو گئی۔

ان سارے معاملات میں ایک آمر حکمراں اور ایک طاقتور لیڈر کی طرح اپنے فیصلے نافذ کرنے کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام اور ہر فیصلہ میں اپنے ساتھیوں کو شریک رکھا۔ حالانکہ اگر کوئی لیڈر اس کا مستحق تھا کہ وہ اپنے فیصلے ازخود نافذ کر دے تو وہ آپؐ تھے اور اگر کسی کی، اس کے باوجود دل وجان سے اطاعت کی جاتی تو وہ آپؐ تھے۔ اس لئے کہ آپؐ ایک عام انسانی لیڈر نہ تھے۔ بلکہ اللہ کے رسولؐ تھے۔

مشورہ کی ان مجلسوں میں شرکار پوری آزادی سے بولتے۔ اپنی رائے پیش کرتے، بحث کرتے، دلائل دیتے اور ان پر کوئی پابندی عائد نہ ہوتی۔ منافق بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتے، اور اس سلسلہ میں قرآن نے جو ہدایات دی ہیں ان سے اس ماحول کا اندازہ ہوتا ہے، جو ان مجلسوں میں پایا جاتا ہے۔ جو چاہتے تھے وہ زور زور سے بول کر، چیخ چیخ کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے تھے وہ اس پر بھی مصر ہوتے تھے کہ انہی کی سنی جائے اور انہی کی مانی جائے اور اللہ اور رسولؐ کی بات پر بھی ان کی بات مقدم ہو۔ اس موقع کے لئے چرب زبانی، دلائل کی فراوانی، قسموں کی بہتات، لچھے دار تقریریں سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ (الحجرات ۵۶ : ۱-۳)

تواضع

آپؐ کی آخری بات جس پر میں اس تذکرہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں ـــ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی، کسی طرح اور کسی پہلو سے اپنے کو اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں فائق و برتر کر کے نہیں رکھا۔ اگر آپؐ ایسا کرتے تو بجا ہوتا۔ آپؐ ہی سب سے زیادہ تفوق کے مستحق تھے۔ آپؐ صرف انسان نہ تھے، اللہ کے رسول تھے۔ آپؐ کا سینہ مہبط وحی تھا۔ آپؐ پر لوگ پروانہ وار فدا تھے۔ لیکن آپؐ نے ہمیشہ تواضع اختیار کی۔ عام ساتھیوں کے ساتھ، ان کی طرح اٹھتے بیٹھتے تھے، چلتے پھرتے تھے، کھاتے پیتے تھے، پہنتے اوڑھتے تھے۔ کسی پہلو سے آپؐ نے خود کو ممتاز نہیں کیا۔ لوگ باہر سے مجلس میں آتے تو پوچھنا پڑتا کہ محمدؐ کون ہیں؟ اپنے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کو آپؐ نے منع فرما دیا تھا۔ کسی نے آپؐ کا رتبہ ذرا بڑھایا نہیں کہ آپؐ نے اس کو ٹوک دیا۔ کسی نے کہا کہ موسیٰؑ سے افضل ہیں۔ تو یہ کہنے سے منع کیا۔ کسی نے کہا کہ جو اللہ چاہے اور جو محمدؐ چاہیں۔ تو اس کو ایسا کہنے سے روک دیا۔ اپنی ذات کو مقصود بننے سے روکا کہ اصل تعلق اور شیفتگی اللہ سے ہونا چاہیئے۔

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس	وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ
ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول	قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں	الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ
یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے	اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى
پاؤں پھر جاؤ گے۔	اَعْقَابِكُمْ (آل عمران۔ ۳: ۱۴۴)

آرزوئے دل

آخری بات یہ عرض کروں گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت، اخلاق کا یہی وہ نور ہے جس سے آج ان لوگوں کو اپنے چراغ جلانا چاہئیں جو دعوت و تحریک کی راہ پر چل رہے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی آپؐ کے مقام بلند تک پہنچنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کیونکہ اس دعوت و تحریک کا چلتا پھرتا کامل ماڈل آپؐ ہیں۔ اس لئے اس نور سے ہم جتنا بھی اپنے اخلاق کو، اپنے دل کو، اپنی عملی زندگی کو روشن کرلیں۔ جتنا بھی ہم حضور صلی اللہ علیہ سے قریب آ سکیں، اتنا ہی ہمارا رب ہم سے محبت کرے گا۔ ہماری کمزوریوں کو دور فرمائے گا۔ ہماری غلطیاں معاف کرے گا۔ اور ہم کو دنیا و آخرت میں فوز و فلاح سے سرفراز کرے گا۔

اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ	قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ
دو۔ کہ اگر تم حقیقت میں اللہ	اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ
سے محبت رکھتے ہو تو میری	اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ
پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے	ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ
محبت کرے گا اور تمہاری	غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔
وہ بڑا معاف کرنے والا اور
رحیم ہے۔

(آل عمران ۔۳: ۔ ۳۱)